JAF & CO
Plot # 43/4 Q-2, Block-8
PECHS Near Jheel Park
Karachi.

ٹام راج سے رام راج تک

سید رئیس احمد جعفری

لاہور اکیڈمی

۲۰۵ سرکلر روڈ ــــ لاہور

انتساب

شیخ بشیر احمد (کوئٹہ۔ صرافہ بازار) کے نام، جو پہلے مسٹر واسدیو تھے۔ لیکن آج سے تیس سال پہلے جنہوں نے اسلام کی حقانیت کے سامنے سر جھکایا اور اسی کے ہو رہے۔ خاندان چھوڑا، بھائی سے رشتہ منقطع ہوا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں نے بائیکاٹ کر دیا، طرح طرح کی اذیتیں دیں، تکلیفیں پہنچائیں، لیکن اس مردِ مومن کے ثبات و استقامت میں لغزش نہ آئی!

(جملہ حقوق دائمی بحق ناشر محفوظ ہیں)

قیمت ——— چھ روپے پچاس پیسے
مطبع ——— منصور پریس ۔ لاہور
ناشر ——— ایس ایم خاں چودھری

فہرست

	صفحہ نمبر
مشاہدات و تاثرات	۱۳
ایک یادگار تاریخی خطبہ	۱۴
ملک و قوم کے بہت بڑے محسن کی خودکشی	۲۰
تام راج اور رام راج	۲۶
پنڈت مالوی اور مسلم مطالبات	۳۲
لارڈ ارون اور موتی لال نہرو	۳۸
نظام دکن لارڈ ولنگڈن اور مولانا شوکت علی	۴۳
قائد اعظم اور راجندر پرشاد	۴۹
مولانا محمد علی کا آخری سفر لندن	۵۴
ایک فرعون مزاج انگریز	۵۹
۵۰۔ برس پہلے کا سیاسی ہندوستان	۶۵
ام الاحرار بی اماں کا ایک خط	۶۶
ام الاحرار کا ایک اہم مکتوب	۷۴
علی برادران کی نظر بندی۔ مسز بسنٹ کا وائسرائے سے ملاقات کے بعد بیان	۸۰
مسز بسنٹ کے نام ام الاحرار کا خط	۸۵
علی برادران کی نظر بندی کا مسئلہ	
مسٹر گھاٹے کا خط مسز بسنٹ کے نام	۱۰۲
مسز اوما نہرو کے نام ام الاحرار کا خط	۱۳۱
ام الاحرار کا پیام مسلمانان ہند کے نام	۱۳۵
خانقاہ اشرفیہ کا مخالفانہ فتویٰ	۱۴۳

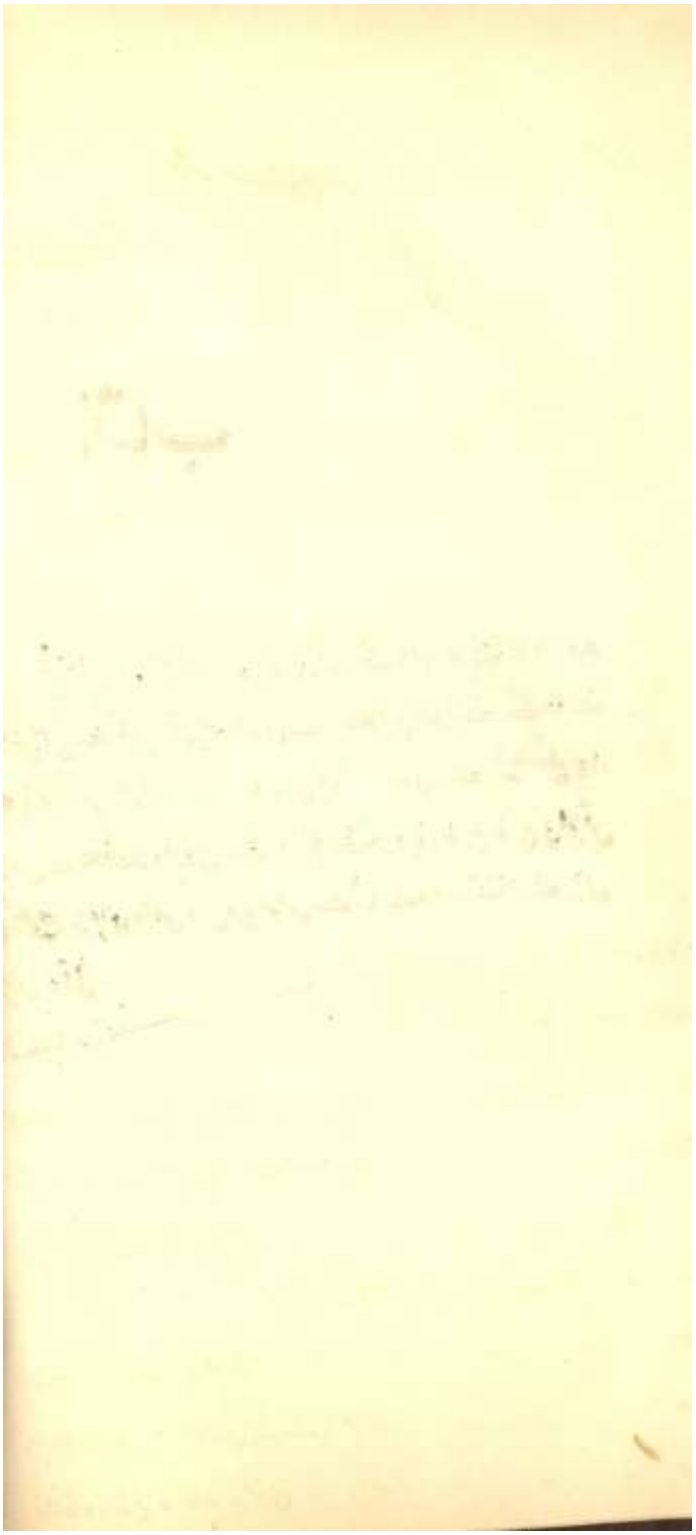

۲۰- بھارت آزادی کے بعد ..
۲۱- ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا ..
۲۲- کوچۂ چیلاں میں محمد علی کا دفتر ..
۲۳- شریف منزل کا ویرانہ ..
۲۴- قائداعظم اور ڈاکٹر انصاری کا نشان منزل ..
۲۵- مولانا فضل حق خیرآبادی کی حویلی ..
۲۶- صنم خانہ ..
۲۷- مقبول میاں ..
۲۸- حضرت نورالشائخ ..
۲۹- قاضی ولی محمد ..
۳۰- ظفر علی خاں ..
۳۱ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت ..
۳۲- نواب عبداللہ خاں ..
۳۳- بابو بشمبر ناتھ ..
۳۴- عبدالحق، باتیں اس کی یاد رہیں گی۔ ..
۳۵- مولانا بخاری، کچھ یادیں ..
۳۶- مولانا حفیظ اللہ (شمس العلماء) ..
۳۷- مولانا طیح آبادی ..
۳۸- شاہ معین الدین ندوی ..
۳۹- نجیب اشرف ندوی ..

حرفِ آغاز

میری یہ کتاب، جو درحقیقت مجموعہ ہے افکارِ پریشاں کا —
دو حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ ایک حصہ میں میرے مشاہدات و تاثرات ہیں جن سے روزنامہ خلافت بمبئی کے عہدِ ادارت میں میرے ذہن و دماغ نے اثر قبول کیا۔ یا اس سے پہلے کے وہ سیاسی احوال و مسائل جن کی یاد تازہ رہ گئی۔

روزنامہ خلافت کا عہدِ ادارت خاصا طویل ہے۔ اس عرصہ میں میرا سیاسی شعور پختہ ہوا۔ میں نے بہت سے اکابر کو —

ہندو بھی۔ اور مسلمان بھی قریب سے دیکھا۔ بہت سی سیاسی تحریکوں کے بانیوں کو اور زیادہ قریب تر ہو کر دیکھا۔ یہ دور تھا انقلاب کا۔ شورش کا۔ ہنگامہ کا۔ ساتھ ہی ساتھ، باہمی تعصبوں کا۔ ہندو مسلم آویزش کا۔ سیاسی رقابتوں کا۔ کشمکش باہمی کا۔ انگریز کی سیہ کاریوں اور شاطرانہ حکمت عملیوں کا۔

اس دور میں مسلمان۔ مسلمان کی حیثیت سے ہندو ہندوستانی کی حیثیت سے۔ انگریز ثالث بالخیر کی حیثیت سے مصروف جہد و پیکار تھے اگر نگاہ تحقیق سے دیکھئے، تو صرف مسلمان تھے جن کی پالیسی صاف اور بے رنگ تھی۔ جن کے ہاں ذہنی تحفظ نہ تھا۔ ورنہ دوسروں کے ہاں، مطلب برآری کے لئے پینترے بدلنا، ذہنی تحفظ کے ساتھ معاملات طے کرنا۔ اور وقت پڑنے پر تمام وعدوں اور معاہدوں سے منحرف ہو جانا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میں نے اس دور کی اچھائیاں بھی دیکھیں اور برائیاں بھی۔ خوبیاں بھی اور تلخیاں بھی۔ ان میں سے کچھ زبان قلم پر آ گئیں۔ بہت کچھ "علم سینہ" کے طور پر محفوظ رہیں۔ انہیں اب تک قلم بند نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن جی چاہتا ہے، کہ اس سعی فضول اور جرات رندانہ کا مظاہرہ بھی کر ڈالوں

اگر زندگی اور صحت نے مہلت دی تو انشاءاللہ

یہ عجیب و غریب سیاسی تاریخ جس کے بہت سے پہلو اب تک بے نقاب ہیں سامنے آئے گی۔ اور اسے پڑھ کر اگر کچھ لوگ انگشت بدان رہ جائیں تو کم از کم مجھے اس پر ذرا حیرت نہ ہوگی۔

۲۔ دوسرے حصہ زیادہ تر شخصیات کے لئے مختص ہے۔

اس میں نامور اور کم نام، شخصیتوں کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان شخصیتوں کا یہ تذکرہ میرے گہرے ذاتی مطالعہ اور مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ گو مدتیں گزریں زمانہ ہوگیا، لیکن نہ میں انہیں بھول سکا ہوں۔ نہ ان کے نقوش میرے حافظہ سے محو ہو سکے ہیں۔

مجھے امید ہے میری یہ ناچیز کوشش اہل علم اور ارباب نظر سے اگر خراج تحسین نہیں حاصل کر سکے گی۔ تو ان کی خدمت میں شرف قبول ضرور حاصل کرے گی۔ اور میرے فخر کے لئے یہ بھی بہت ہے۔

آخر میں مجھے ناشر کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب چھاپنے پر آمادگی

ظاہر کی جو اگرچہ دستاویزی حیثیت رکھتی ہے
لیکن جو ایک محدود اور مخصوص طبقہ تک
محدود رہے گی۔

رئیس احمد جعفری
۸۹ ٹیگور پارک
لاہور

مشاہدات و تاثرات

مسائلی جنگ میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ لیگ اور کانگریس کا اتحاد اس کے لیے خاصہ تشویش انگیز تھا اس لیے یہ دونوں بڑی جماعتیں اور بڑی قوتیں مل کر متحدہ مطالبہ پیش کر سکتی تھیں اور حکومت کو اصلاحات سیاسی کی ایک نئی قسط دینے پر مجبور کر سکتی تھیں۔

چنانچہ حکومت کے اشارے پر اس جلسہ کو درہم برہم کرنے کی منظم کوششیں کی گئیں۔ مسٹر سلیمان قاسم مٹھا جو ابھی زندہ ہیں اور اب بہت بڑے کانگریسی ہیں پیش پیش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلسہ نہ ہو اور اگر ہو تو حکومت برطانیہ سے اظہار وفاداری کا اظہار کر کے ملتوی ہو جائے۔ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ چونکہ ترکوں سے حکومت برطانیہ لڑ رہی تھی اور مسلمانوں کو ترک قوم سے والہانہ عقیدت تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ لیگ کے اجلاس میں ترکوں سے اظہار ہمدردی کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے زرخرید لوگوں کو لے کر پہنچے اور جلسہ درہم برہم کر دیا۔

آخر یہ جلسہ تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ مسٹر مظہر الحق اس جلسہ کے صدر منتخب ہوئے۔ مسٹر مظہر الحق بہار کے زبردست اور مانے ہوئے قانون دان تھے۔ مسجد کانپور کے حادثۂ انہدام کے سلسلے میں انہوں نے گراں بہا خدمات انجام دی تھیں۔

تحریک خلافت شروع ہوئی تو اس میں دل و جان سے شریک ہو گئے عدالتوں کے بائیکاٹ کا جب خلافت اور کانگریس نے فیصلہ کیا تو انہوں نے بلا تامل بیرسٹری ترک کر دی اور جو شخص ہزاروں روپے روز کماتا تھا وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگا۔ جو اعلیٰ درجہ کا قیمتی سوٹ پہنا کرتا تھا، وہ کھدر کے موٹے لباس میں ملبوس نظر آنے لگا۔ جو کلین شیو رہتا تھا اس نے ڈاڑھی رکھ لی۔ جس کی راتیں کلبوں میں بسر ہوتی تھیں وہ اب تہجد گزار بن گیا۔۔۔!

بہار میں خلافت اور کانگریس کی تحریک کو فروغ دینے اور وہاں کے عوام میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے میں مسٹر مظہر الحق کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد

ایک یادگار تاریخی خطبہ

قائدِ اعظمؒ کی سیاسی زندگی کا آغاز ایک نیشنلسٹ کی حیثیت سے ہوا فرقہ پرستی سے انہیں نفرت تھی، تعصب ان کی سرشت کے خلاف تھا۔ وہ بہت بڑے اور بڑے کٹر محبِ وطن تھے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے بے شک وہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے قائل تھے، ان کی انفرادیت پر مصر تھے۔ بااین ہمہ ان کا خیال تھا کہ تہذیبی، ثقافتی اور دینی اختلاف کے باوجود دونوں قومیں مل کر رہ سکتی ہیں اور انہیں مل کر رہنا چاہیے۔ جو لوگ مساعی اتحاد میں رخنہ اندازی کرتے ہیں وہ نہ اپنے ملک کے دوست ہیں نہ اپنی قوم کے، نہ اپنے مذہب کے۔

یہی وجہ تھی کہ ہندو مسلم افتراق سے ان کا دل کڑھتا تھا اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے وہ ہمہ تن سرگرم عمل تھے۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ یہ مقام بمبئی منعقد ہوا۔ اس موقع پر قائدِ اعظم نے جو ابھی صرف مسٹر جناح تھے ذاتی طور پر جد و جہد کر کے لیگ کا سالانہ اجلاس بھی بمبئی میں مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ہی شہر میں اور ایک ہی زمانے میں لیگ اور کانگریس کا اجلاس اگر منعقد ہو تو دونوں ملتوں کے سربرآوردہ اصحاب کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کے موقعے ملیں گے، غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی اور اعتماد باہمی کا دور شروع ہو جائے گا۔

یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا حکومت ہر اُس چیز سے بھڑکتی تھی جس سے

بجائے ایک دوسرے کے صحیح نقطۂ نظر کو سمجھنے کے مخالفانہ ضد البتہ قابل اعتراض ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں برسرپیکار ہوں اور قومی ترقی کو خاک میں ملادیں۔ ایسی ضد سے سوائے نقصان کے نہ ملک کو فائدہ ہوتا ہے نہ خود کسی جماعت کو مگر خوشی کا مقام کہ اب اختلاف دور ہو رہے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم کسی اور امر پر غور کریں ہمیں ہندوستان میں اپنی حیثیت سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس برعظم میں مختلف لوگ بستے ہیں۔ ہر قوم اپنی ذمہ داری اور فرائض محسوس کرتی ہے۔

ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ ہم کس قدر قلیل تعداد میں یہاں آئے اور آخر عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے لیکن باوجود بادشاہ ہو لینے کے ہم نے ہندوستان کو اپنا مستقل وطن سمجھا اگر کسی شخص کو ایسا سمجھنے میں اعتراض ہو تو کیا کہہ سکتا ہے کہ سلاطین مغلیہ نے ہندوستان کے علاوہ کسی اور جگہ اپنا گھر بنا رکھا تھا؟ کیا وہ سالانہ یا پانچ سال کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جاتے تھے؟ نہیں ممالک اسلامیہ سے ہر سال تازہ خون ہندوستان میں آتا تھا اور وہ بھی یہیں کا ہو جاتا تھا۔ سلاطین مغلیہ کی عمارات سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زر کثیر خرچ کر کے انہوں نے ہندوستان کی رونق کو دوبالا کیا؟ کیا تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان کے علاوہ انہوں نے کسی اور جگہ بھی ایسی شاندار تعمیرات کیں؟ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ ہندوستان سے انہیں محبت تھی اسے وہ اپنا وطن تصور کرتے تھے یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ سات کروڑ مسلمانوں میں سے صرف اسی لاکھ مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ غیر ممالک یا بیرون ہند سے آتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ سوا چھ کروڑ مسلمان ہندی ہیں ہم نے ہمالیہ اور راس کماری تک اپنے تمدن و تہذیب سے ملک کو مالا مال کیا یہ تو مشاہدہ کی بات ہے کہ کابل کا وزیر اعظم وزیر جنگ اور وزیر مال ہندو تھے فرقہ وارانہ تعصب مسلمانوں نے

ہندوستان کے موجودہ صدر مملکت مظہر الحق کے دبستانِ سیاست کے تلمذ رشید ہیں جس کا انہوں نے متعدد مواقع پر اعتراف بھی کیا ہے۔ پٹنہ کے کانگریس ہاؤس کا نام مظہر الحق نے "صداقت آشرم" رکھا تھا۔ یہ نام اب تک چلا آرہا ہے۔ ابھی حال ہی میں راجندر پرشاد نے پٹنہ کے ایک خصوصی اجتماع میں اعلان کیا تھا کہ اب وہ صدر مملکت کے انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے اور خاموشی کے ساتھ زندگی کے بقیہ دن صداقت آشرم میں رہ کر تعمیری خدمت میں گزار دیں گے۔

لیگ کے اس اجلاس میں مسٹر مظہر الحق نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ اپنی معنویت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خطبہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمان کس طرح بار بار کانگریس کی طرف ہندو اکثریت کی طرف اور ہندو سیاسی جماعتوں کی طرف دستِ تعاون بڑھاتے رہے اور جب تک یہ ہاتھ بار بار جھٹک کر شل نہیں کر دیا گیا وہ اپنی روشِ مصالحت پر قائم رہے۔ جب بالکل مایوس ہو گئے اور کسی سے کوئی امید نہیں رہ گئی تب جا کر تقسیم ہند کا مطالبہ انہوں نے شروع کیا اور پھر اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک اپنے اکثریتی منطقوں کو آزاد کرا نہ لیا۔

مسٹر مظہر الحق نے خطبۂ صدارت میں فرمایا:-

بعض حلقوں میں اس پر اعتراض کیا جا رہا ہے کہ لیگ کا اجلاس کانگریس کے ساتھ ساتھ اس شہر میں کرنے کا مطلب ہے کہ کانگریس سے لیگ کا ادغام لیکن یہ کتنی بڑی غلطی ہے۔ قومی اتحاد قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر گروہ اور فرقہ کے جذبات اور خصوصیات کا واضح طور پر اندازہ اور احساس ہو۔ مسلمان فاتحانہ تاریخ رکھتے ہیں! ان کی قومی روایات بالکل جُدا ہیں۔ قومی اور ملکی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرقہ کی طرف سے ایک سر دار اوراہ نمائندگی کرے جو ان کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کر سکے۔

بھی فرض ہے کہ وہ بھی رواداری اور تعاون سے کام لیں جب تک دونوں قوموں میں یہ جذبہ نہ ہوگا اتحاد ناممکن ہے۔ جب تک ایک فرقہ دوسرے سے مساویانہ برتاؤ نہ کرے گا اتحاد ناممکن ہے اگر ایک اپنی برتری محسوس کرے تو دوسرا کیونکر اتفاق قائم کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتحاد برابر کی طاقتوں ہی میں ممکن ہے۔ طاقتور اور کمزور میں صلح نہیں ہوتی۔

کبھی بھی پاس نہ آنے دیا۔ سلطنت مغلیہ کی باگ ڈور ہمیشہ غیر مسلموں کے ہاتھ رہی مسلمانوں کا رشتہ عالمِ اسلام سے مذہبی اخوت کی بنا پر ہے اور نہایت عالمگیر اور استوار ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ ہم اپنے معاملات میں غیر ملکی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں وہ مسلمانوں کو بدنام کرتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کا فرضِ اولین یہ ہے کہ خدا کے احکام کی تعمیل کریں اور مناسب ذرائع بہم پہنچائیں کہ ان فرائض کے ادا کرنے میں آسانی ہو حکومت کا ہاتھ ان امور میں بٹائیں جو خلقِ خدا کی بہتری کے لیے ہوں۔

ہمسایہ قوم کے متعلق بھی ہمارے فرائض ہیں ہم اتنے کوتاہ نظر نہیں کہ جب کوئی معاملہ ہندوستان کی ترقی کے لیے پیش کیا جائے تو ہم اس میں تعاون نہ کریں۔ البتہ اگر وہ چیز احکامِ شریعت کی مخالفت میں ہو تو خواہ کتنی ہی بڑی دنیاوی طاقت کا حکم کیوں نہ ہو ہم کبھی بھی اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ وطنیت کا جذبہ ہم میں کسی سے کم نہیں ہم ہر قوم اور ہر فرقہ سے تعاون اور اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے ملک کی ترقی ہو یا احکام عدل و انصاف سب قوموں کے لیے یکساں ہے اگر اختلاف ہے تو چند فروعی معاملات میں لیکن اگر مختلف فرقوں کے لیڈر ذرا سنجیدگی سے کام لیں تو وہ بھی حل ہو سکتے ہیں۔

ہمیں اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے ہم نے دوسروں پر بہت بھروسہ کیا۔ ہندوؤں سے بلا وجہ بددل رہے ہمیں ان سے قریب ہو کر اور خود اپنی ذات پر بھروسہ کر کے پبلک لائف میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں میں آپس میں بہت اختلاف ہے اس اختلاف کو مٹانے کی ضرورت ہے کیونکہ مضبوط جماعتی نظام ہی کامیابی کی کنجی ہے۔

جس طرح ہمارا فرض رواداری اور تعاون کا ہے اسی طرح ہمسایہ قوموں کا

ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں ہیں۔ جواہر لال تک ان کی عزت کرتے ہیں، بابو راجندر پرشاد ان کے سامنے سر جھکاتے ہیں، سوبھاش چندر بوس کے مقابلہ میں جب وہ صدارت کانگریس کا الیکشن ہار گئے تو گاندھی جی نے ایک پبلک بیان میں اسے اپنی ذاتی شکست قرار دیا تھا۔ بعد میں یہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور شاید دوسرے صدران کانگریس کے مقابلہ میں وہ واحد شخص تھے جن کا احترام آخر وقت تک گاندھی جی کرتے رہے۔

انہی ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ نے کئی جلدوں میں کانگریس کی طویل و ضخیم تاریخ لکھی ہے، اس کا مقدمہ سابق صدر مملکت ہند راجندر پرشاد نے لکھا ہے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔

اس تاریخ میں تمام صدران کانگریس کا ذکر، ان کی سیرت و کردار کی تفصیل ان کے ایثار و قربانی کی داستان موجود ہے لیکن مسلمان لیڈروں کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ علی برادران کی شاندار خدمات کو وہ تقریباً فراموش کر گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو آخر وقت تک کانگریس سے وابستہ رہے، ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتے جتنی غیر معروف، غیر مسلم صدران کانگریس۔ مسلمانوں نے کانگریس کو کانگریس بنایا۔ مسلمانوں نے کانگریس کی غیر معمولی مالی امداد کی، ہر نازک مرحلے پر۔ آخری دور سے قبل تک جب کانگریس صرف ہندو جماعت بن کر رہ گئی تھی، انہوں نے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

کا سبق بار بار دہرایا۔

میرا خیال ہے کچھ عرصے کے بعد بالکل بھول جائیں گے کہ کانگریس کی تعمیر و احیاء میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ زمانے کی رفتار تو میں نہیں روک سکتا، لیکن اس سے یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ ذرا:

ملک و قوم کے بہت بڑے محسن کی خودکشی

آج ہندوستان آزاد ہے اور آزاد ہندوستان کی بہت سی تاریخیں بازاروں میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے والے ذمہ دار لوگ ہیں وہ لوگ جنہوں نے آزادی کی جنگ لڑی ہے، جنہوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا ہے جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں، جنہوں نے اپنے مقصد اور اپنے عقیدے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ جان بھی دی اور کنگال بھی ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے ان اکابر میں کانگریس کے سابق صدر ہیں، سابق سکریٹری ہیں، موجودہ لیڈر ہیں۔

ان تاریخوں میں جو داستان حریت بیان کی گئی ہے میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا میں ان کی تغلیط بھی نہیں کروں گا۔ اس دفتر کو دفتر بے معنی نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں بہت کچھ سچ ہے، بہت سی کام کی باتیں ہیں، بہت سے دلچسپ اور اہم حقائق ہیں۔

لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ضرور ہے۔ عہد حاضر کے ان تمام مورخوں نے جیسے ایکا کر لیا ہے کہ ہندوستان کے شعور آزادی کو ابھارنے اور اجاگر کرنے میں ہندوستان کی اکثریت میں حریت کا ولولہ اور جذبہ پیدا کرنے میں ہندوستان کی سب سے بڑی قوم میں استقلال کی لگن لگانے میں، جادۂ حریت پر اُسے استوار کرنے میں اور اس سلسلہ میں دامے، درمے، قدمے سخنے مسلمانوں کا جو حصہ ہے اسے یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

جو اس ڈاکو کا ہاتھ پکڑ سکتا! — یہ لوٹتا تھا اور لوگ خوشی خوشی لٹتے تھے۔

شوکت علی کی عقابی نگاہوں نے مالداروں اور سرمایہ داروں کو بھی تاکا بمبئی میں ایک دولتمند تاجر عمر ثوبانی تھا، لاکھوں میں کھیلتا تھا، کروڑپتی شخص تھا، روئی کا کاروبار تھا، نہایت کامیاب مٹی میں ہاتھ ڈالتا تھا اور وہ سونا بن جاتی تھی!

عمر ثوبانی کو اس مست الست قلندر شوکت علی نے اپنا اسیر کر لیا اس نے پہلے ہی مطالبہ پر ایک لاکھ روپیہ نذر کر دیا، پھر جب گاندھی جی نے تلک سوراج فنڈ کا نعرہ لگایا تو شوکت علی پھر ثوبانی کے پاس پہنچا اور اس کی جیب سے ایک لاکھ روپیہ نکال لایا اور گاندھی جی کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ تلک سوراج فنڈ میں آج پہلی مرتبہ اور بالکل خلافِ توقع اتنی بڑی رقم جمع ہوئی تھی اور وہ بھی کسی گجراتی سیٹھ کی طرف سے نہیں، ایک مسلمان کی طرف سے معجزہ، دوہرا معجزہ!

ملک اور قوم کا جب کوئی مسئلہ اٹھتا ملک اور قوم کے لیے جب کبھی روپے کی ضرورت ہوتی خلافت اور کانگریس کی طرف سے جب کبھی روپے کا مطالبہ کیا جاتا سب سے پہلے عمر ثوبانی کا چندہ پہنچ جاتا امید سے کہیں زیادہ۔

آج سے چالیس بیالیس سال پہلے کی انگریز حکومت وہ نہیں تھی جس کے سربراہ لارڈ ارون، لارڈ لنلتھگو، لارڈ ڈیول اور لارڈ ماونٹ بیٹن تھے۔ وہ حکومت تھی ان انگریزوں کی، جو اپنے مقبوضات کو ہر قیمت پر اپنا تابع رکھنا چاہتے تھے، اس زمانے میں بمبئی کا گورنر جارج لائڈ — لائڈ جارج نہیں — تھا، جو بعد میں مصر میں برطانیہ کا ہائی کمشنر مقرر ہوا اور جس کی یادگار "لائڈ بیراج" اب بھی سکھر میں موجود ہے۔ یہ بڑا تند خو، بد خو، غلط، رعونت پسند اور قاہر و جابر شخص تھا اس کو عمر ثوبانی کی یہ ملک دوستی اور قوم پرستی نہ بھائی۔ پہلے اس نے بالواسطہ طور پر انہیں "راہ راست" پر لانے کی کوشش کی۔ پھر دوسرے وسائل و ذرائع بروئے کار لایا اور آخر میں افہام و تفہیم سے کام لیا، لیکن ثوبانی کا جواب ایک

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

ہاں تو تصور کیجیے کہ گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔ آیئے میں آپکو ایک منظر دکھاؤں!

گاندھی جی نے تلک سوراج فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے کا ملک سے مطالبہ کیا اور شرط عائد کی کہ ایک سال کے اندر یہ رقم فراہم ہو جانی چاہیے۔

موجودہ نسل نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ملک آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا، انگریزوں کے خلاف مورچے لگ رہے تھے، سرکاری ملازمین میں، فوج میں، طلباء میں، عوام میں، عورتوں میں، بچوں میں آزادی کی روح تڑپ رہی تھی۔ برطانوی سامراج کے خلاف ہر شخص شعلہ جوالا بنا ہوا تھا، لیکن آج سے چالیس سال پہلے یہ صورت نہ تھی۔ لوگ آزادی کا نام سن کر دہل جاتے تھے، انگریز کو دیکھ کر لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے، قید و بند کا تصور ان پر نزع کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ دار و رسن کا افسانہ سنتے بھی تھے تو ان سنی کر کے! ایسے زمانے میں ایک غلام ملک کے باشندوں سے مطالبہ کرنا کہ آزادی کے لیے ایک کروڑ روپیہ سال کے اندر جمع کر دو، مضحکہ خیز تھا۔ ملک میں نہ دولت مندوں کی کمی تھی، نہ سرمایہ داروں کی۔ لیکن اس مضحکہ خیز مطالبے پر لبیک کہنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا!

لیکن اس مضحکہ خیز مطالبہ پر ایک مفلس اور دیوانے شخص نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا۔ یہ شوکت علی تھا!

شوکت علی خود بھی ترکوں کی امداد و اعانت کے لیے "انگورا فنڈ" کی فراہمی میں مشغول تھا، قوم کے لیے بھیک مانگنے کے فن میں اسے کمال حاصل تھا، وہ جس کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا تھا، لے کر اٹھتا تھا۔ وہ انگریز کے پٹھوؤں، سرکار پرستوں اور خطاب یافتوں تک کی جیب پر نہایت کامیابی سے ڈاکے ڈالتا تھا اور کوئی نہ تھا

سارے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہندو اور سارے مسلمان سب ہی اس غم میں سوگوار تھے دارالخلافت اور کانگریس ہاؤس ہر جگہ صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ اس موقع پر گاندھی جی نے جو تعزیت کی وہ یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا:

"ثوبانی نے لاکھوں اور کروڑوں کمائے وہ ایک دن میں لاکھوں کما لیتا تھا لیکن ایک ہی لمحے میں اس نے سب کچھ کھو دیا اور جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ ملک کی مالی امداد و اعانت کرنے والوں کی جماعت میں سب سے آگے نہیں رہ سکتا تو اس نے اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کیا۔!

ہی تھا!

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے!!

جارج لانڈ نے نفرت بھری نظروں سے ثوبانی کو دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

گاندھی جی کی دی ہوئی مدت ختم ہونے میں دو تین ماہ رہ گئے تھے اور سوراج فنڈ میں مشکل سے پینسٹھ لاکھ روپیہ جمع ہو سکا تھا۔ بڑے دکھ کے ساتھ انہوں نے یہ بات شوکت سے کہی شوکت نے عمر ثوبانی کا دامن پکڑا۔ ثوبانی نے بمبئی کے تاجروں کو بالعموم اور میمن تاجروں کو بالخصوص مدعو کیا اور ان سے اپیل کی کہ یہ کمی جلد از جلد پوری کر دیں خود اپنی طرف سے تین لاکھ کا اعلان کیا اور شوکت سے کہا مطمئن رہیے ... گھر کے برتن تک بیچ دوں گا لیکن وقت مقررہ پر یہ رقم پوری کر دینے کا ذمہ لیتا ہوں یہ بات اڑتے اڑتے جارج لانڈ کے کانوں تک بھی پہنچی وہ بپھر گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ ثوبانی کو عبرت ناک سزا دے کر رہے گا۔

ثوبانی کے جتنے سرکاری ٹھیکے تھے وہ منسوخ کر دیے گئے۔ جتنے ڈیپازٹ تھے ضبط کر لیے گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روئی کا نرخ گھٹا دیا گیا۔ بازار کا نرخ اگر دس روپے گانٹھ تھا تو گورنر نے امریکہ، مصر، اور دوسرے مقامات سے روئی خرید کر نرخ اتنا گرا دیا کہ اب دو روپے گانٹھ رہ گیا۔

دیوالیہ نکل گیا!

عمر ثوبانی جو کل تک کروڑ پتی تھا اب ایک مفلس شخص تھا اب اُس کی میرے پاس ایک پائی بھی نہ تھی! جس کے دروازے پر لوگ آتے تھے اور جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے تھے اب وہ خود اس پوزیشن میں آگیا تھا کہ دوسروں کے سامنے کاسۂ گدائی

عمر ثوبانی کے لیے ایک راستہ اب تک کھلا تھا، اس نے خودکشی کر لی۔

ایک طرف کانگریس نے نہرو رپورٹ منظور کر لی اور اس کے اثر سے دوسری بہت سی سیاسی جماعتوں نے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی دوسری طرف مسلمان یہ شکایت کرتے رہ گئے کہ نہ سندھ کا حق تسلیم کیا گیا نہ سرحد کو صوبہ بنایا گیا، نہ مجالس آئین ساز میں تعین نشست کی گئی اور نہ جداگانہ انتخاب منظور کیا گیا۔ لیکن ان کی شکایات سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ منتشر تھے، پراگندہ تھے۔ نہ ان کی آواز میں زور تھا اور نہ اُن کے مطالبہ میں قوت۔ ان کی جماعتیں آپس میں لڑ رہی تھیں، ان کے لیڈر جنگ زرگری میں مشغول تھے، ان کے رہنما مختلف کیمپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کوئی کانگریس میں تھا، کوئی خلافت میں، کوئی لیگ میں، کوئی انڈی پنڈنٹ پارٹی میں، کوئی کہیں نہیں لیکن ہر جگہ۔

یہ وقت تھا جب محمد علی علاج نامکمل چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک کانگریس اس مسلک پر عامل تھی کہ اقوام ہند کے حقوق کا تصفیہ آزادیٔ ہند کے بعد ہو گا ہم غیر مشروط طور پر اس کے ساتھ تھے ہم نے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، ہم نے اس سے کوئی تنازع نہیں کی اور ہم آنکھ بند کر کے اس کا ساتھ دیتے رہے، اس وقت بھی ہم نے رفاقت اور تعاون سے ہاتھ نہیں کھینچا جب خود بڑے بڑے ہندو رہنما کانگریس سے روٹھ روٹھ کر الگ ہو رہے تھے۔ لیکن اب کانگریس نے خود ہی ایک دستور وضع کیا ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس دستور کو اقوام ہند تسلیم کر لیں اور پھر اسے متحدہ اور متفقہ مطالبے کی صورت میں برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اس سے کہا جائے آزادی دو یا لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، یہ بڑا اہم اور نازک مرحلہ ہے۔ اس موقع پر اگر ہم خاموش رہتے ہیں تو اپنی قوم کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوں گے۔ حق و صداقت کی بارگاہ میں ہماری حیثیت کچھ بھی نہیں رہ جائے گی۔ ہم مجبور ہیں کہ اپنے مطالبات پیش کریں اور اس وقت تک لڑائی جاری رکھیں، جب تک کامیاب نہ ہو جائیں۔

ٹام راج اور رام راج

مولانا محمد علی کانگریس سے مایوس، گاندھی جی سے دل برداشتہ اور ہندوؤں سے بددل ہو کر تحفظ حقوق مسلمین کے لیے میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے۔ انھوں نے مقدور بھر پوری کوشش کی کہ ہندو مسلم اتحاد خوابِ شیریں سے ایک ٹھوس حقیقت بن جائے لیکن ان کی کوششیں کارگر نہ ہوئیں اور ہندو مسلم اتحاد عمل میں نہ آسکا۔ تحریکِ خلافت عہدِ شباب میں یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے جس قدر قریب آگئی تھیں تحریکِ خلافت کے انحطاط کے بعد اتنی ہی دور ہوتی گئیں، اختلافات بڑھتے گئے، تنازعات میں اضافہ ہوتا گیا۔ تلخی، بدمزگی اور منافرت، کا دور شروع ہو گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے تابوت میں آخری کیل پنڈت موتی لال نہرو نے نہرو رپورٹ پیش کر کے ٹھونکی۔

نہرو رپورٹ سے پہلے تک محمد علی اپنی قوم سے یہی کہتے تھے کہ تصفیہ حقوق کا یہ وقت نہیں ہے۔ پہلے آزادی پھر حقوق کا تصفیہ لیکن نہرو رپورٹ ہندوستان کے مجوزہ دستور کا نام تھا جس کی تصدیق و توثیق کانگریس نے کر دی تھی اور دوسری سیاسی جماعتوں سے بھی کرائی جا رہی تھی۔ اس موقع پر محمد علی سخت بیمار تھے اور علاج کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے تھے۔ آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ان کی عدم موجودگی میں ہوا اور اُس نے نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا۔ مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی نے مخالفت کی لیکن ان کی آواز مخالفانہ نعروں میں دب گئی۔

شوکت علی کے دوش زبردست پر تھا اگرچہ وہ مسلمانانِ ہند کے محبوب و مقبول زعیم تھے۔ لیکن نہ بلند آہنگ خطیب تھے، نہ شعلہ مقال واعظ، نہ سحر طراز انشاء پرداز لیکن خدا نے انہیں غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، وہ نااہلوں اور نالائقوں کے انبوہ کو فوج ظفر موج بنا لینے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ دال روٹی کھلا کر، بلکہ بھوکا رکھ کر وہ کام لیتے تھے جو دوسرے بریانی اور مرغِ مسلّم کھلا کر بھی نہیں لے پاتے تھے، ان کی مخالفت مجلس احرار کی طرف سے ہو رہی تھی، جمعیتہ علماء کی طرف سے ہو رہی تھی، کانگریس کی طرف سے ہو رہی تھی، خود اپنے دیرینہ اور عزیز محبوب رفقاء کار کی طرف سے ہو رہی تھی۔ مولانا ابوالکلام نے زمیندار میں اُن کے خلاف مقالات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا ڈاکٹر انصاری جیسا کم سخن شخص ان کے خلاف خود ان کے اور ان کے بھائی کے اخبار ہمدرد میں مضامین لکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود بیان پر بیان دے رہے تھے، ہندوستان کے طول و عرض میں جلسے ہو رہے تھے، مظاہرے ہو رہے تھے، تحریکیں پاس ہو رہی تھیں، ہنگامہ آرائی کی جا رہی تھی، لیکن ان سب کے مقابلے میں یہ کوہ پیکر اور کوہ وقار شخص اکیلا ڈٹا ہوا تھا، مضمون کا جواب مضمون سے، تقریر کا جواب تقریر سے، بیان کا جواب بیان سے دے رہا تھا، یہ اکیلا ایک طرف تھا اور ساری خدائی دوسری طرف۔ یہ نتائج سے بے پروا ہو کر خدا پر بھروسہ کر کے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

فریاد و فغاں بلبلِ ناشاد کیے جا

اس کی فریاد و فغاں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا، کامیابی کے ساتھ اس معنی میں کہ یہ اکیلا مسلمانوں کی رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آ رہا تھا۔

مولانا محمد علی اب تک نہیں آئے تھے۔ انہیں مختلف جماعتوں اور مختلف لیڈروں کی طرف سے تار پر تار دیے گئے، خطوط لکھے گئے، اپیل کی گئی کہ جلد از جلد ہندوستان واپس

آج ہم اگر خاموش رہتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس مجوزہ دستور کو منظور کر لیا اور آج منظور کرنے کے بعد کل اُسے مسترد نہیں کر سکتے اور اگر مسترد کریں گے تو دنیا ہم پر ہنسے گی۔ وہ کہے گی، جب دستور بن رہا تھا، جب تشکیل دستور کے مراحل طے ہو رہے تھے، جب اقوام ہند کے حقوق کی تعین اور تقسیم ہو رہی تھی، جب ہر قوم کو اس کا حق مل رہا تھا اس وقت خاموش رہے، اس وقت ان کے منہ سے حرفِ شکایت نہ نکلا۔ اس وقت انہوں نے نہ کوئی مطالبہ پیش کیا، نہ شکایت کی، نہ ترمیم و تجویز کے ذریعہ اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار کیا، لیکن جب دستور بن گیا۔ جب ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی، جب برطانوی پارلیمنٹ نے اُسے منظور کر لیا جب وہ نافذ کر دیا گیا تو اب اُس کی مخالفت کی جا رہی ہے، اب اُس میں کیڑے نکالے جا رہے ہیں۔ اب اس میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ؎ ہر کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد!"

یہ تھا وہ موقف جس کی بنا پر محمد علی، شوکت علی اور اُن کے رفقاء نہرو رپورٹ کے خلاف احتجاج کر رہے تھے اور اس میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کر رہے تھے۔

لیکن بدقسمتی سے مسلمان خود آپس میں متفق نہیں تھے۔ ان کے افتراق نے گاندھی جی اور کانگریس کے ہاتھ مضبوط کر دیے تھے۔ مجلس احرار، جمعیۃ علماء ہند اور دوسری جماعتیں نہرو رپورٹ کی تائید و حمایت علی الاعلان کر رہی تھیں۔ بہرحال جہاں تک باب خلافت اور علی برادران کا تعلق تھا، وہ نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ مسلمانوں کی وکالت کر رہے اور ان کے حقوق کے لیے جنگ کر رہے تھے۔

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، نہرو رپورٹ جب آل پارٹیز کانفرنس میں پیش کی گئی اور منظور کی گئی تو محمد علی علاج کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے تھے سارا بار تنہا مولانا

ہے، پھر اب اس سے انحراف کیوں؟"

"ہاں یہ میں نے کہا ہے، اور اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہتا رہوں گا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو غلامی کی زندگی بسر کرنی ہے تو میں تمام راج پر رام راج کو ترجیح دیتا ہوں۔"

"یہ آپ نے کیا کہا؟"

"اگر قسمت کا فیصلہ یہ ہے کہ مسلمان غلام ہی رہیں تو انگریز کے بجائے میں ہندو کو اپنا آقا خوشی سے تسلیم کروں گا۔ لیکن ——"

"لیکن کیا؟"

لیکن مسلمان اپنی قسمت خود بناتا ہے وہ کسی کا غلام نہیں بن سکتا، نہ انگریز کا نہ ہندو کا، وہ اپنے حقوق حاصل کرے گا، وہ راکھ نہیں ہے، وہ دبی ہوئی چنگاری نہیں ہے وہ آگ ہے، وہ شعلہ ہے، وہ شرر ہے۔ دیکھو تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفان بھی ہے! اور یہی شوکت طوفان ابھرے گی اور وہ اپنے حقوق منوا کر، اپنے حقوق لے کر رہے گا!"

بات ختم ہو گئی، محمد علی کراچی سے ہندوستان کے دورے پر روانہ ہو گئے کانگریس نے ضرور پورٹ منظور کر لی، لیکن مسلمان اپنے حقوق کے لیے جنگ کرتے رہے۔ محمد علی عالم فانی سے عالم باقی میں پہنچ گیا، خدا نے دوسرا محمد علی (جناح) قوم کو دے دیا اور اس نے ثابت کر دیا کہ واقعی مسلمان کی شوکت طوفان ابھر سکتی ہے، وہ اپنے حقوق منوا سکتا ہے، وہ اپنے حقوق چھین سکتا ہے۔ پاکستان زندہ باد!

(اگست ۱۹۶۱ء)

پہنچیں۔

محمد علی کو اپنی صحت عزیز تھی، لیکن قوم کا مفاد صحت سے زیادہ عزیز تھا انہوں نے علاج کو نامکمل چھوڑا، رخت سفر باندھا اور وطن کی طرف باول رنجور، باتن بسمل چل پڑے۔

محمد علی کی ہندوستان آمد سے پہلے ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں اور رائے عامہ کو زیادہ سے زیادہ گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔

آخر وہ دن آیا کہ محمد علی کراچی پہنچے،۔!

یہاں نمائندگان صحافت کا ایک گروہ ان کے استقبال کے لیے موجود تھا ان سب نے انہیں گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات شروع کر دیے۔

ایک نمائندہ اخبار نے سوال کیا:

"نہرو رپورٹ کو کیا آپ بھی مسترد کر دیں گے۔؟"

محمد علی نے جواب دیا۔ نہرو رپورٹ کوئی خدائی صحیفہ تو نہیں ہے کہ اس میں ترمیم نہ ہو سکے!

ایک اور سوال کیا گیا یہ برطانوی سامراج کے چیلنج کا جواب ہے۔ لارڈ برکن ہیڈ نے طعنہ دیا تھا کہ ہندوستانی اپنا متفقہ دستور بھی نہیں پیش کر سکتے، آزادی کیا حاصل کریں گے؟ اس موقع پر کیا آپ رخنہ اندازی کریں گے؟

جواب میں محمد علی نے کہا۔ تو پھر متفقہ دستور پیش کرنے سے موتی لال نہرو کو کس نے منع کیا ہے،

"یہ متفقہ دستور ہی تو ہے!"

"لیکن مسلمانان ہند اس کے مخالف ہیں، وہ چند ضروری ترمیموں کے بغیر اسے قبول نہیں کر سکتے!"

"تصفیہ حقوق کے بارے میں آپ خود فرما چکے ہیں کہ اس کا وقت آزادی کے بعد

گاندھی جی نے اتحاد کے اس روح پرور منظر اور برطانوی سامراج کے تزلزل کو دیکھ کر سوراج کی تاریخ تک متعین کر دی تھی کہ ایک سال کے اندر سوراج حاصل ہو جائے گا۔ پنڈت مالوی اُٹھے انہوں نے لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کو ورغلایا کہ علی برادران اتحاد عالم اسلام (پان اسلامزم) کے علمبردار ہیں۔ ان کو جتنی جتنی قوت حاصل ہوگی، اتنی ہی برطانوی سامراج کی گرفت مصر، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک پر ڈھیلی ہو جائے گی۔ دوسری طرف انہوں نے گاندھی جی کو سبق پڑھایا کہ ہندوستان پر افغانستان کے راستے سے کئی بار حملہ ہو چکا ہے اور ہر حملے میں ہندوستان کو شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ آج بھی افغانستان میں ایک ایسا جواں سال اور جواں بخت فرماں روا (امان اللہ خاں) موجود ہے جو موقع کی تاک میں ہے۔ اس نے اگر حملہ کیا اور ضرور حملہ کرے گا، تو یہ علی برادران اس کے سپہ سالار ہوں گے اور مسلمانانِ ہند اس کے رضاکار۔ ہندوؤں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اس دشمن سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ لہٰذا پہلے سنگھٹن کے ذریعہ انہیں مضبوط ہونا چاہیے قوت حاصل کرنی چاہیے اور شدھی کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد گھٹانی چاہیے پھر آزادی کا نام لینا چاہیے۔ اس وقت تو انگریزوں کا وجود ہمارے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جو ہمیں ہر بیرونی حملہ آور دشمن سے بچائے ہوئے ہیں۔

مالوی جی ان دلائل سے گاندھی جی کو قائل نہیں کر سکے لیکن اپنی قوم کو انہوں نے قائل کر لیا۔ بڑے بڑے کانگریسی کانگریس سے کٹ کر ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے لالہ لاجپت رائے کی رفاقت نے انہیں اور زیادہ ہر دلعزیز بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایجی ٹیشن سے ہندو مسلم اتحاد کا سفینہ ٹکرا کر غرق ہو گیا۔ گاندھی جی نے چوری چورا کے حادثہ کے بعد تحریکِ سول نافرمانی واپس لے لی اور سارے ملک پر عام اضمحلال طاری ہو گیا۔ اب نہ آزادی کے ترانے تھے، نہ حریت کے نغمے، نہ کئی کئی میل لمبے جلوس تھے، نہ حد نظر تک پھیلے ہوئے مشترک جلسے، نہ اللہ اکبر، بندے ماترم اور ست

پنڈت مالوی اور مسلم مطالبات

پنڈت مدن موہن مالوی گوناگوں محاسن اور کمالات کے حامل تھے۔ وہ فارسی کے اسکالر اور اردو کے بلند پایہ ادیب تھے لیکن انہی کی ذات ستودہ صفات تھی جس نے اردو ہندی کا فتنہ کھڑا کیا۔ یہ زبانی جنگ، جنگل کی آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی اور ہندو مسلم اتحاد کے خرمن کو اس نے جلا کر خاکستر کر دیا۔ اسلامی لٹریچر سے متعلق ان کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع تھیں۔ اسلامی روایات و ثقافت سے بھی وہ بہت اچھی طرح واقف تھے جس خاندان میں انھوں نے پرورش پائی اسے ہندو مسلم اتحاد سے گہرا لگاؤ تھا اور جس شہر (الہ آباد) میں انہوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں اور ہندو مسلم اتحاد کا مرکز تھا لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف تھے۔ کانگریس اور خلافت کے باہمی تعاون سے جب انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ برطانوی مال کا بائیکاٹ شروع ہوا۔ انگریزی کالجوں اور مدرسوں پر تالے لگنے لگے عدالتوں پر سناٹا چھا گیا۔ نہ مدعی موجود نہ مدعا علیہ۔ نہ وکیل کا پتہ، نہ ملازموں کا۔ جب پرنس آف ویلز (سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم موجودہ ڈیوک آف ونڈسر) کی خیر مقدمی تقریبات کا اس شان سے مقاطعہ ہوا کہ کلکتہ اور دوسرے بڑے شہروں کی بڑی بڑی سڑکوں پر ہو کا عالم چھا گیا۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی

جب گاندھی جی اور علی برادران کے اتحاد نے مذہبی انفرادیت کو تحفظ کے ساتھ ساتھ قومی وحدت کا ایسا عدیم النظیر نمونہ پیش کیا، جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی جب

کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر ایک فصیح و بلیغ تقریر کی۔ مولانا محمد علی نے وہیں ڈائس پر فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے پاؤں چھو لیے اور کھڑے ہو کر اعلان کیا، مالوی جی آج سے ہند اقلیتوں کے امین ہیں جس طرح مصر کے قبطیوں نے برطانیہ کے مقرر کردہ وفد کمیشن سے صاف صاف کہہ دیا تھا، ہمارے مطالبات ہم کچھ نہیں جانتے جاؤ سعد پاشا زغلول سے بات کرو، وہی ہمارا ترجمان اور امین ہے، اس طرح ہم سائمن کمیشن سے کہہ دیں گے۔ ہمارے مطالبات پوچھنا ہے تو جاؤ، مالوی جی سے پوچھو وہ ہمارے ترجمان اور امین ہیں!

مدراس کانگریس کا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا لیکن جب گفت و شنید شروع ہوئی تو معلوم ہوا مالوی جی مسلمانوں کے ان حقوق کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں جو انگریزوں کے دور میں ان کو حاصل ہیں۔

۱۹۳۲ء میں گاندھی جی نے سول نافرمانی شروع کی، کانگریس ورکر مجمع عام میں پانی سے نمک بنا کر سالٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے اور گرفتار ہو جاتے، گاندھی جی اور بہت سے لیڈر جیل پہنچ گئے۔ ایک روز مالوی جی کی طبیعت بھی لہرائی۔ وہ بمبئی میں کانگریس کے ایک کمی جیل لیے خلاف قانون جلوس کی قیادت کرتے ہوئے بڑھے۔ پوری بند کے پاس فوج در فوج، ورمرہ در موج پولیس موجود تھی۔ اس نے مورچہ سنبھالا اور رستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ مالوی جی وہیں سارے جلوس کے ساتھ دھرنا مار کر بیٹھ گئے پولیس اور مالوی جی کی یہ کشمکش ۱۸ گھنٹے تک جاری رہی، آخر مالوی جی گرفتار کر لیے گئے اور مجمع آنسو گیس چارج کر کے منتشر کر دیا گیا۔ اس روز دہلی میں عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا ابو الکلام آزاد نے مالوی جی کے حب وطن اخلاص اور جذبہ آزادی کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کچھ دنوں کے بعد یہ تحریک بھی ختم ہو گئی، لیڈر جیل سے رہا ہوئے اور پھر ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

مہری اکال کے نعرے تھے۔ ہندو مسلم منافرت شباب پر تھی۔ ہندو مسلم فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، گانے باجے اذان اور ناقوس کے مناقشات پر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ انگریز خوش تھا کہ قدرت نے اسے ایک نادر موقع توسیع مملکت کا عطا کر دیا۔ آزادی و حریت کے متوالے ملول و افسردہ تھے کہ ایک بہترین موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے، گاندھی جی نے مرن برت رکھے، کانگریس نے ولولہ انگیز تجویزیں منظور کیں۔ رہنماؤں اور رہبروں کی ایک بڑی جماعت نے جیل آنے جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کئی مرتبہ سول نافرمانی کی، تحریک شروع ہوئی، کبھی معطل ہوئی، کبھی ملتوی، کبھی بند!

لیکن ہندو مسلم اتحاد بہرحال ناگزیر تھا۔ اب تک نہ ہندو کا ذہن اس طرف گیا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو سکتا ہے، نہ مسلمان نے یہ سوچا تھا کہ وہ اپنی دنیا الگ بسا سکتا ہے جب ایک ہی ملک میں دونوں کو رہنا ہے تو اتحاد ضروری ہے۔ بغیر اتحاد کے آزادی نہیں مل سکتی

چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے مختلف مقامات پر صلح کانفرنسیں منعقد ہوئیں، کبھی لکھنؤ میں۔ کبھی الہ آباد میں، کبھی شملہ میں، کبھی بمبئی میں اور کبھی کلکتہ میں۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ یہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھتے تھے اور دل توڑ کر اٹھتے تھے مسلمانوں نے اتحاد اور آزادی کی خاطر بار بار اپنے مطالبات میں قطع و برید کی لیکن مالوی جی اور ان کے رفقا کے شرائط سخت سے سخت تر ہوتے گئے۔

مالوی جی جب تک صرف عوام کے لیڈر رہے، کانگریس سے بے تعلق اور بیزار رہے، جب ان کی قیادت کا دائرہ خواص، اور تعلیم یافتہ اصحاب تک وسیع ہو گیا تو انہوں نے کانگریس سے ناتہ جوڑا۔ مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی زیر قیادت کانگریس

گفتگو ختم ہو گئی۔ مالوی جی واپس چلے گئے ان کا خیال تھا مسلمان ۳۰-۳۳ سے ۲۵ پر آجائیں گے۔ لیکن ان کا یہ خیال نہیں تھا کہ اگر ۲۵ پر آئیں گے تو معاملہ نشستوں کا نہیں رہے گا! ۲۵ فیصد ملک تقسیم ہو جائے گا!

ایک مرتبہ "یونٹی کانفرنس" کے اکابر کا اجتماع بمبئی میں ہوا۔ مالوی جی پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کے کم از کم مطالبات کو غور بسیار کے بعد بڑی حد تک نہ صرف کانگریس نے بلکہ بعض دوراندیش قسم کے ہندو سبھائی لیڈران مسٹر چٹرجی، مسٹر کلیکر، مسٹر اینے وغیرہ نے بھی منظور کر لیا تھا۔ لیکن مالوی جی مزید قطع و برید پر بضد تھے۔ بات رکی یہاں آکر کہ مسلمان مرکزی اسمبلی میں ۳۳ فیصدی نشستیں طلب کرتے تھے۔ مالوی جی ۲۵ سے آگے بڑھنے پر تیار نہ تھے۔ سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے معتدل مزاج رہنماؤں نے بار بار مالوی جی سے التجا کی کہ اس ایک بات پر، جو بالکل معمولی سی بات ہے، ہندو مسلم اتحاد کا امکان ختم نہ کریں لیکن خلقت بہ منت یک طرف و آں شوخ تنہا یک طرف۔ مالوی جی کی "نہیں" چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم تھی۔

ایک روز مولانا شوکت علی نے مالوی جی کو خلافت ہاؤس میں مدعو کیا۔ انہیں امید تھی کہ وہ مالوی جی کو راہ راست پر لے آئیں گے۔ مالوی جی وقت مقررہ پر تشریف لائے۔ شوکت صاحب نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور بڑے دوستانہ لہجے میں کہا

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

پھر انہیں لا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اپنے من موہن انداز میں گفتگو شروع کر دی۔ جہاں تک تہذیب، شائستگی، متانت اور اخلاق کا تعلق تھا، مالوی جی اپنے مد مقابل سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں تھے۔ بڑی اپنائیت کے ساتھ ساری باتیں سنتے رہے۔ کبھی کسی بات پر ہنس پڑتے کبھی مسکرانے لگتے، کبھی زیر لب تبسم پر اکتفا کرتے۔ کافی دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا مگر۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

واضح رہے ۔صرف ایک سال پہلے یعنی ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے اجلاس سالانہ منعقدہ مدراس میں آزادیٔ کامل کی تجویز کانگریس منظور کر چکی تھی۔

ایک سال گزر گیا لیکن حکومت برطانیہ نے نہرو رپورٹ کو نہ ہندوستان کا متفقہ دستور اساسی تسلیم کیا۔ نہ درجۂ نوآبادیات دینے کا اعلان کیا۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں نہرو رپورٹ زائد المیعاد قرار دی گئی اور آزادی کامل کی تجویز کا پھر اعادہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اگر حکومت برطانیہ نے یہ مطالبہ نہ مانا تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔

لارڈ ارون کی کمزوری یعنی ان کی نیکی اور شرافت سے کانگریس واقف تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ سول نافرمانی کی تجویز کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ علی برادران اس سے ناراض تھے اور اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے اور اس گئی گزری حالت میں بھی مسلم عوام پر جتنا اثر ان دونوں بھائیوں کا تھا کسی کا نہ تھا۔ لہٰذا کانگریس کی خواہش یہ تھی کہ صلح ہو جائے اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ گاندھی جی نے ڈکٹیٹر مقرر ہونے کے بعد لارڈ ارون کو جو خط لکھا تھا اور جو کم سے کم مطالبات پر مشتمل تھا وہ اسی حقیقت کی غمازی کر رہا تھا۔

اب ضرورت اس کی تھی کہ لارڈ ارون سے ملاقات کی سبیل نکلے تا کہ انہیں شیشے میں اتارا جا سکے۔ لیکن ملاقات کس طرح ہو؟ گاندھی جی کانگریس کی قائم کردہ مجلس جنگ (وار کونسل) کے ڈکٹیٹر مقرر ہو چکے تھے اور وہ الٹی میٹم دے سکتے تھے۔

مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ گو اس کی اکثریت نہ تھی۔ اس پارٹی یعنی حزب اختلاف کے لیڈر۔ موتی لال نہرو تھے۔ وہ بہترین مقنن، بہترین سیاست دان اور بہترین نقاد تھے۔ ایوانِ اسمبلی میں جب وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو حکومت کی دھجیاں بکھیر دیتے تھے۔ طے کیا گیا کہ کسی طرح موتی

لارڈ اروِن اور موتی لال نہرو

ہندوستان میں جتنے وائسرائے آئے ان سب میں لارڈ اروِن، جو بعد میں لارڈ ہالی فیکس کے نام سے مشہور ہوئے۔ سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ شریف اور سب سے زیادہ معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے سب سے بڑے، بااختیار اور مطلق العنان نمائندے تھے۔ ان کے دست تصرف میں سب کچھ تھا لیکن قوت و طاقت کے استعمال سے وہ ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ ان کی کوشش یہی رہی کہ جس طرح بھی ہو، خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی گتھیاں سلجھ جائیں۔ ان کی شرافت اور عالی ظرفی کا ان کے بدترین دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں۔

لارڈ اروِن کے عہد وائسرائلٹی میں نہرو رپورٹ تیار ہوئی، جس میں ہندوستان کے لیے درجۂ نوآبادیات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کا ہے۔

نہرو رپورٹ سے مسلمانوں نے اور دوسری اقلیتوں نے اختلاف کیا، لیکن پنڈت موتی لال نہرو نے کوئی ترمیم بھی منظور نہیں کی۔ وہ اس پر بضد تھے کہ رپورٹ جوں کی توں منظور کر لی جائے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ موتی لال نہرو صدر منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں رپورٹ بغیر کسی ترمیم کے منظور کر لی گئی۔ گاندھی جی نے حکومت برطانیہ کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ایک سال کے اندر ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات نہ عطا کیا گیا تو ہم کامل آزادی کا مطالبہ پھر سے شروع کر دیں گے

ہل اور وائسرائے کی ملاقات کا بندوبست ہونا چاہیے۔ موتی لال اپنی سیاست اور
ذہانت کے شکنجے میں لارڈ اروِن کو اس طرح جکڑ لیں کہ پھر کچھ ان کے بنائے نہ بنے گی
اب سوال پیدا ہوا ملاقات کی سبیل کیا ہو۔ کانگریس بہرحال ترک تعاون اور
مقاطعہ کی پالیسی پر گامزن تھی۔ وہ اعلانِ جنگ بھی کر چکی تھی۔ اب وہی اگر صلح کا
سفید جھنڈا لہرائے تو کیا بھرم رہ جائے گا۔ عوام پر بھی اس کا برا اثر پڑے گا اور
حکومت برطانیہ بھی سمجھ لے گی کہ کانگریس لڑنے کی سکت نہیں رکھتی۔ صرف گیدڑ
بھبکیوں سے کام نکالنا چاہتی ہے۔

آخر کافی غور و فکر کے بعد وٹھل بھائی پٹیل کو اس کام پر مامور کیا گیا وہ مرکزی
اسمبلی کے صدر تھے اور صدر کی حیثیت سے وائسرائے سے لے کر ہوم ممبر تک سب
سے ملتے جلتے اور راہ و رسم رکھتے تھے۔

مسٹر پٹیل نے ایک گارڈن پارٹی میں وائس رائے کو مدعو کیا۔ صدر اسمبلی کی دی
ہوئی دعوت کا مسترد کرنا وائسرائے کے لیے آسان نہ تھا۔ قبل کرتے ہی بنی اس
پارٹی میں کئی کانگریسی لیڈر اور خاص طور پر پنڈت موتی لال نہرو بھی مدعو کیے گئے انہوں
نے یہ دعوت بڑی خوشی سے قبول کر لی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

پارٹی میں مسٹر پٹیل نے وائسرائے سے موتی لال کا تعارف کرایا وہ تپاک اور
گرم جوشی سے ملے، کچھ رسمی باتیں ہوئیں پھر اصل موضوع زیر بحث آیا۔ یعنی یہ کہ اگر
حکومت برطانیہ نہرو رپورٹ کو قبول کر لے اور ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دے
پر رضامند ہو جائے تو جنگ ٹل سکتی ہے، صلح ہو سکتی ہے، معاملات سدھر سکتے ہیں
بصورت دیگر آزادیٔ کامل سے کم پر سمجھوتہ نہیں ہو سکے گا۔ گفتگو نہایت دوستانہ
ماحول میں ہوئی۔ لیکن پروان نہ چڑھ سکی۔

بات یہ ہے کہ لارڈ اروِن لاکھ نیک اور شریف سہی لیکن جہاں تک

سیاست دانی، معاملہ فہمی اور دور اندیشی تدبّر کا قطعی تضاد کسی سے کم نہیں تھے۔ بیشک وہ کانگریس سے مرعوب تھے، اس کی طاقت کو محسوس کرتے تھے مطالبۂ آزادی کی اہمیت سے ناواقف نہیں تھے، لیکن حقائق سے آنکھیں تو نہیں بند کر سکتے تھے۔ نہرو رپورٹ کو کانگریس نے مان لیا تھا بلکہ یہ رپورٹ اسی کی تخلیق تھی لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان نے مسترد کر دیا تھا۔ سکھوں نے بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اچھوت (بھرپور) قوت اور شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ دوسری سیاسی جماعتیں بھی اس کے متعدد پہلوؤں سے اختلاف کا اظہار کر چکی تھیں۔ کانگریس کو خوش کر کے ملک کے دوسرے اہم عناصر کو ناراض کر لینا شیوۂ دانش تھا نہ آئین تدبّر۔ انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ دستور ہندوستان کا متحدہ اور متفقہ دستور نہیں ہے۔ مسلمان من حیث القوم اس کے خلاف ہیں دوسری اقلیتیں بھی اس کے خلاف اظہار جذبات کر چکی ہیں۔ ان حالات میں اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت برطانیہ صرف اس دستور پر غور کر سکتی ہے جو اقوام ہند کی تائید، پسند اور اتفاق پر مبنی ہو۔

بد قسمتی سے ابھی چند روز پہلے اسمبلی کے ایک مباحثے میں پنڈت موتی لال اور مسٹر جناح میں زبردست جھڑپ ہو چکی تھی۔ پنڈت نہرو نے جو اپنی پارٹی کی طرف سے تقریر کر رہے تھے حکومت پر زور دیا کہ وہ نہرو رپورٹ کو، جو اقوام ہند کا متفقہ دستور ہے منظور کر لے۔ مسٹر جناح نے اب تک پبلک طور پر نہرو رپورٹ کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس موقع پر ضبط نہ کر سکے۔ انہوں نے مخصوص انداز میں اپنی انڈیپنڈنٹ پارٹی کی طرف سے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا کہ نہرو رپورٹ ہرگز ہندوستان کا متحدہ دستور نہیں ہے۔ مسلمان اسے مسترد کر چکے ہیں۔ مسٹر جناح کے لب و لہجہ اور الفاظ میں تلخی اس لیے پیدا ہو گئی کہ اپنے کئی رفیقوں کو ناراض کر کے وہ کوشش کر رہے تھے کہ پنڈت

نظام دکن لارڈ ولنگڈن اور مولانا شوکت علیؒ

دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک جگ بیت جاتا ہے۔ واقعات و حوادث ماضی کے پردے میں روپوش ہو جاتے اور رفتہ رفتہ حافظہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ ماضی کا پردہ کتنا ہی دبیز ہو لیکن وہ لوحِ دماغ پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے، بھلائے نہیں بھولتے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میں آج آپ کو سناتا ہوں یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے۔ نئی دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا۔ وٹھل بھائی پٹیل کا دورِ صدارت قصۂ پارینہ ہو چکا تھا سرشان مکھم چٹی پریذیڈنٹ کے معزز منصب پر فائز تھے اور زبانِ حال سے فرماتے تھے:

دورِ مجنوں گزشت نوبتِ ماست

لارڈ اروِن جیسے مرنجاں مرنج شریف اور نیک شخص کے بجائے لارڈ ولنگڈن گورنر جنرل اور وائسرائے آف انڈیا تھے۔ انہوں نے وائسرائے لاج میں قدم رنجہ فرماتے ہی قیامت برپا کر دی۔ گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے، جواہر لال نہرو زنداں کر دیے گئے چوٹی کے کانگرسی لیڈروں کو ایک ایک کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ گاندھی جی کی تحریکِ سول نافرمانی نے کئی پلٹے کھائے اور اب وہ دم توڑ چکی تھی۔ لیکن راکھ میں چنگاریاں اب تک دبی ہوئی تھیں۔ سڑکوں اور چوراہوں پر نہیں، صوبائی مجالس آئین ساز اور مرکزی اسمبلی میں!

حکومت کی طرف سے ایک بل پیش کیا گیا۔ اس بل کے پیش ہوتے سے چند روز

جی چند ترمیمیں منظور کر کے مسلمانوں کو مطمئن کر دیں لیکن انہوں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی ترمیم منظور نہیں کریں گے یہ تلخی اس مایوسی کا نتیجہ تھی، لارڈ ارون نے مسٹر جناح کے اس چیلنج کا بھی حوالہ دیا اور دوستانہ طور پر اصرار کیا کہ اپنے ملک کے دوسرے اہم عناصر کو ہم نوا بنالیں۔ پھر اس طرح کا مطالبہ کریں۔

دوستانہ گفتگو اعلان جنگ پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد موتی لال، پٹیل اور دوسرے کانگریسی ممبران اسمبلی مستعفی ہو گئے۔ گاندھی جی نے مسول نافرمانی کا آغاز گجرات کے ایک مقام ڈانڈی سے کیا اور بہت جلد سارے ہندوستان میں یہ تحریک پھیل گئی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ کچھ ہی مدت بعد گاندھی جی اسے واپس لینے پر تیار ہو گئے کیونکہ مسلمان تو مسلمان ہندو بھی پورے طور پر ان کے ساتھ نہیں تھے!

(اگست ۱۹۶۱ء)

مولانا شوکت علی مغفور مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے "وہ مسلم یونٹی بورڈ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور یہ بورڈ انتخاب کے بعد گوشۂ لحد میں پہنچ گیا تھا، لہٰذا مولانا پر جماعتی حیثیت سے کوئی پابندی نہ تھی انہیں پوری آزادی تھی کہ جس فریق کا چاہیں ساتھ دیں۔ کانگریس نے ہر ممبر کے در پر دستک دی اور ووٹ کے لیے دریوزہ گری کی لیکن کانگریس کے رہنماؤں میں سے کسی کو بھی ہمت نہ پڑی کہ مولانا سے عرض مدعا کرتا کیونکہ کانگریس کی مسلم آزار پالیسی کے باعث وہ اس کے سخت مخالف تھے اور گاندھی جی سے لے کر جواہر لال تک سب کی خبر لیتے تھے ان کے سامنے ان میں سے کسی کو مجال دم زدن بھی نہ تھی۔ کیونکہ گاندھی جی کے بارے میں وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے!

حسن پہ اپنے جو نازاں ہے یہ تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی، دہن غنچہ کا، حیرت میری

اور جواہر لال سے بھی فرما سکتے تھے:

منم کردہ ام رستم داستان
وگرنہ یلے بود در سیستان!

اس حقیقت سے شاید اب بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں — گاندھی اور جواہر لال — کی سیاسی شخصیت کی تعمیر میں خلافت فنڈ اور علی برادران کی سحر طراز شخصیت کا بہت بڑا دخل تھا۔ کچھ کانگریس سے بیزاری کے باعث اور کچھ اس سے کہ لارڈ ولنگڈن سے مولانا کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ ارباب حکومت کو امید تھی کہ ان کا ووٹ مخالفت میں نہیں جا سکتا۔

اسمبلی کا اجلاس جاری رہا۔!

شعلہ بار تقریروں نے اسمبلی کا ہال گونجا دیا۔ —!

اب ووٹ شماری کا دن قریب آتا جا رہا تھا۔ ایک روز گوبند ولبھ پنت نے

پہلے لارڈ ولنگڈن نے ایک تقریر میں ارشاد فرمایا تھا کہ ہندوستان کو آزادی کی روح حاصل ہے۔ صوبوں کے علاوہ مرکز میں ایک مجلس آئین ساز قائم ہے۔ تمام معاملات و مسائل اس میں پیش کیے جاتے ہیں اور اسمبلی کو انہیں منظور یا نامنظور کر دینے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ یہ اگر آزادی کی روح نہیں تو کیا ہے۔

لارڈ ولنگڈن کی اس تقریر کو برطانوی اخبارات نے خوب اچھالا۔ رائٹر نے برق سے یہ مژدہ ساری دنیا کو بالعموم اور یورپ و امریکہ کو بالخصوص سنا دیا کہ ہندوستان گو آزادی سے فی الحال محروم ہے لیکن روحِ آزادی اسے بہرحال حاصل ہے

کانگریس کے پاس اس لاف زنی کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ حکومت کی طرف سے جو بل پیش ہو نہ صرف اُس کی مخالفت میں دھواں دھار تقریریں کی جائیں بلکہ زیادہ سے زیادہ اکثریت سے اسے مسترد کر دیا جائے۔ چنانچہ کانگریس کی طرف سے کوئی [illegible] کا مظاہرہ شروع ہو گیا اور بقول اقبال —

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

قوم، وطن، انسانیت، حریت، دوستی اور حق و صداقت کے نام پر کانگریس نے بہت سے غیر سرکاری ممبروں کو توڑ لیا۔ قائد اعظم اس وقت تک صرف مسٹر جناح تھے اور گو انہیں مسلمانوں سے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف تھا لیکن تمام ملکی معاملات میں وہ کانگریس کی ہمنوائی زور شور سے فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس بل کی مخالفت میں — گویا کانگریس کی تائید میں — ایک زوردار تقریر ارشاد فرمائی۔ اب تو حکومت کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے بھی اس بل کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور طے کر لیا کہ ہر صورت یہ بل اسمبلی سے منظور کرا کے رہے گی۔ چنانچہ اس کی طرف سے بھی کنویسنگ کا سلسلہ زور شور سے شروع کر دیا گیا۔

جو ذہنی طور پر کٹر کانگریسی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ مولانا کے علی گڑھ کے گہرے اور پرانے دوست بھی تھے۔ مایوسی کے عالم میں کہا:

"شوکت کا ووٹ انگریز کے ساتھ جائے گا!"

میں نے پوچھا "یہ آپ نے کیسے یقین کر لیا؟"

فرمایا "بوڑھا ہو چکا ہے قوم کی خدمت میں عمر گزار دی اگر قوم گالیوں کے سوا کچھ نہ دے سکی۔ اسے روپے کی ضرورت ہے۔ سر یامین خاں کوشش کر رہے ہیں کہ ضبط شدہ پنشن مل جائے اور وہ انسرائے بھی اس کار خیر کو انجام دینے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ نظام کے ہاں بھی اس کی اعزازی پنشن کے کاغذات چل رہے ہیں یقین ہے وہ بھی جلد منظور ہو جائے گی۔ رات کو وہ لنگڈن کے ہاں ڈنر دن کو نظام کے ہاں لنچ اس کے بعد اسمبلی میں رائے شماری ——— کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے، شوکت کا طرز عمل کیا ہو گا؟"

میں نے کہا میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں۔ شوکت صاحب کی مالی حالت گو بعد مقیم ہے لیکن وہ قلندر صفت آدمی ہیں۔ ولنگڈن کی پنشن یا نظام کا وظیفہ انہیں نہیں خرید سکتا ——!

وہ چپ ہو گئے میں بھی خاموش ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی قیام گاہ کو چلے گئے میں بھی شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سہ پہر کو خیال آیا اسمبلی چل کر دیکھنا چاہیے رائے شماری کا نتیجہ کیا نکلا ہے اور شوکت صاحب نے آخر کدھر ووٹ دیا ہے۔

ابھی میں آدھے راستے میں تھا کہ سامنے سے ایک موٹر آتی ہوئی نظر آئی اور میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔ شوکت صاحب نے مجھے آواز دی!

"اندر آ جاؤ!"

میں اگلی نشست پر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا۔ بہت جلد ہم لوگ قرول باغ پہنچ گئے ان کے دوست نے نہایت فخر و ناز اور محبت کے ساتھ شوکت صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔

جو مولانا سے کافی بے تکلف تھے پوچھا،

"بتلایئے مولانا آپ کو ووٹ دیں گے۔ ہمارے ساتھ یا حکومت کے ساتھ۔ مانا کہ لارڈ ولنگڈن سے آپ کے ذاتی تعلقات ہیں، لیکن ہم بھی دیرینہ نیازمند ہیں اور نگاہِ کرم کے متمنی ہیں۔"

مولانا نے شوخ اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے پنت کی طرف دیکھا اور اپنے ڈنڈے کی ٹیک لے کر اٹھتے ہوئے کہا

"میں ادھر ووٹ دوں گا جدھر حق ہوگا۔ نہ لارڈ ولنگڈن کی دوستی مجھے خرید سکتی ہے نہ تمہاری نیازمندی۔"

پنت نے خوش ہو کر کہا "بس تو آپ کا ووٹ ہمارا ہو گیا!"

اس گفتگو کے وقت اسمبلی کے کئی سرکاری اور غیر سرکاری ممبر بھی موجود تھے اور ان میں حکومت ہند کا انگریز ہوم ممبر بھی تھا۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ اس جواب نے خلجان میں ڈال دیا ہے۔ مولانا کے ووٹ سے متعلق اس نے جو آس لگا رکھی تھی وہ اب یاس سے بدلتی نظر آ رہی تھی۔

اسمبلی کے اجلاس سے فارغ ہو کر مولانا اپنی قیام گاہ پہنچے، تھوڑی دیر کے بعد ..... لاج سے فون آیا، ان کا سکریٹری بول رہا تھا:

"ہز ایکسی لینسی نے آج ڈنر پر آپ کو مدعو کیا ہے۔"

مولانا نے مسکراتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ رات کو بہت دیر میں واپس آئے اور سو رہے۔ صبح ناشتے پر بیٹھے تھے کہ نظام پیلس کا ایک پیامبر پہنچا اور اس نے نوید سنائی کہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس نے آج لنچ پر آپ کو مدعو کیا ہے۔ مولانا نے یہ دعوت بھی ایک بندہ نواز تبسم کے ساتھ قبول کر لی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر مولانا   جب اسمبلی روانہ ہو گئے تو ایک صاحب نے

قائدِ اعظم اور راجندر پرشاد کی ایک یادگار ملاقات

۱۹۳۴ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ بابو راجندر پرشاد جو اب ہندوستان کے صدرِ مملکت ہیں صدر منتخب ہوئے۔ بمبئی کانگریس کے صدر اور سکریٹری مسٹر نریمان اور مسٹر عابد علی جعفری بھائی نے اجلاس کو کامیاب بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، ویسے بھی کئی سال کے سیاسی طوفان، شورش، ایجی ٹیشن کے بعد میں جمود و تعطل کے بعد یہ اجلاس منعقد ہوا تھا اس لیے اطراف و اکناف ہند سے ہزاروں بڑے بڑے رکن شرکت کے لیے تشریف لائے تھے ساحل سمندر پر وربی کے وسیع و عریض میدان میں اجلاس منعقد ہوا چند قدم کے فاصلے پر بحر ناپیدا کنار کی تڑپتی ہوئی موجیں ساحل سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں اللہ میاں اس میدان میں آدمیوں کا ایک بحر ذخار نظر آ رہا تھا۔ اس میں بھی ہلچل تھی، طوفان تھا، خروش تھا اور وہی تڑپ، وہی بیتابی، وہی اضطراب اور وہی سر چڑھنے کا جذبہ کارفرما تھا جو سمندر کی بلند موجوں میں نظر آ رہا تھا۔

مسلم لیگ ابھی تک حیاتِ تازہ سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی۔ سیاست کی دنیا میں اس کی حیثیت ایک کھوٹے سکے سے زیادہ نہ تھی۔ لیگ کے نعم البدل کے طور پر مسلم کانفرنس عالمِ وجود میں لائی گئی تھی۔ لیکن وہ شباب و عروج کی منزل تک پہنچنے سے پہلے عالمِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف کوچ کر گئی۔ کانگریس کے حریف ہونے کی حیثیت سے اگر کوئی جماعت موجود تھی تو صرف خلافت کمیٹی تھی لیکن ارباب خلافت اور زعمائے کانگریس کے مابین اختلاف تھا شدید نوعیت کے اختلافات کے باعث مفاہمت کا کوئی امکان ہی نہیں

"۔۔۔ تم نے تو مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ حکومت کی شکست صرف تمہارے دوش کا نتیجہ ہے۔!۔۔۔ وہنگٹن اور نظام تمہیں ذرا بھی ہموار نہ کر سکے۔!"

شوکت صاحب نے دل میں کھب جانے والے انداز کے ساتھ ہنستے ہوئے فرمایا "میں نے ولنگڈن سے کہہ دیا میں اپنے ملک و قوم سے غداری کر کے تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں لیکن اس غداری کی قیمت "فلسطین" ہے!" ایسا معلوم ہوا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ایک حرف بھی جو اس کے منہ سے نکلا ہو۔!"

مولانا کے دوست نے سوال کیا اور نظام سے کیا کہا آپ نے؟

مولانا نے فرمایا میں نے نظام سے کہا:۔

"آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ بیچتی بکتی شوق سے نکل جاؤں گا۔ ملک و قوم دونوں سے۔ غداری کرونگا بشرطیکہ برار آپ کو واپس مل جائے!"

مولانا کے دوست نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا واہ کیا کہنا ہے شوکت تمہارا۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔!

(اگست ۱۹۶۱ء)

یک معروف ہیں یہ مطالبات واقعی کم از کم تھے ان میں کوئی جارحانہ جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ نیشنلزم کے خلاف کوئی بات نہیں تھی سندھ محض دھاندلی کے زور پر بمبئی سے ملحق تھا۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے لیکن سندھ کے ہندو اسے بمبئی سے ملحق رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا کانگریس بھی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ اسے جداگانہ صوبہ بننے دے۔ صوبہ سرحد نے آزادیٔ ہند کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ قائداعظم کی خواہش تھی کہ اسے سرزمین بے آئین کی بجائے دوسرے ہندوستانی صوبوں کی طرح ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے، لیکن سرحد کے ہندو اور سکھ اس مطالبہ کے مخالف تھے اس لیے کانگریس بھی لیت ولعل سے کام لے رہی تھی۔ ہندوستان کی اقلیت و اکثریت جماعتی اور طبقاتی بنیاد پر نہ تھی یعنی ایسی صورت نہ تھی کہ آج مزدور پارٹی اکثریت میں ہے۔ اس نے حکومت بنالی، کل قدامت پسند پارٹی نے اکثریت حاصل کرلی اور وزارت اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس قابلیت اور اکثریت کی بنیاد مذہب پر تھی۔ لہٰذا یہ مستقل تھی۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ ایک حقیقت پسند کی طرح اس ٹھوس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے۔ اور ایک ایسا اصول تسلیم کرلیا جائے جس کے بعد اقلیت و اکثریت کی مستقل حیثیت قائم رہے۔ لیکن کسی کو وجہ شکایت نہ پیدا ہو سکے۔ یعنی تناسب آبادی کے اعتبار سے سرکاری ملازمتوں میں اور مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے حقوق کا تعین کردیا جائے۔ اصولی طور پر کانگریس یہ بات مانتی تھی لیکن اسے عمل میں نہیں لانا چاہتی تھی۔ لہٰذا نئے نئے نکتے پیدا کرکے، اس اصول کو تسلیم کرچکنے کے باوجود اسے بروئے کار لانے سے گریز کررہی تھی۔

راجن بابو سے گفتگو شروع ہوئی تو اسی نہج پر۔ قائداعظم نے انہی باتوں پر زور دیا اور یاد دلایا کہ اصولی طور پر کانگریس انہیں منظور کرچکی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ توثیق مزید کردی جائے۔ اس طرح مسلمان مطمئن ہو جائیں گے اور قومیت متحدہ کا تصور ایک حقیقت بن جائیگا۔

راجندر پرشاد کی قابلیت، معاملہ فہمی، دور اندیشی، سیاستدانی اور ہوش و گوش

تھا، ماتا کہ کانگریس اور خلافت میں کوئی اتحاد نہیں ہو سکتا لیکن ہندو مسلم اتحاد تو ناگزیر تھا گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کیسے ہو؟

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے ذمہ داران کانگریس کو بتایا کہ یہ گتھی اگر سلجھا سکتا ہے تو صرف وہ شخص جس کا نام جناح ہے وہ شوکت علی کی طرح متعصب نہیں۔ محمد علی کی طرح دیوانہ نہیں، حسین احمد کی طرح مذہب پرست نہیں ہمیشہ کا نیشنلسٹ ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے غیر معمولی اور غیر فانی کارنامے انجام دے چکا ہے، قومیت متحد کا علمبردار ہے، ہندو مسلم اتحاد کا ہمیشہ سے داعی ہے۔ آزادیٔ ہند کا متوالا ہے۔ ہوم رول لیگ میں اس کی قیادت نے روح تازہ پیدا کر دی تھی۔ وہ مدت مدید سے سفیر صلح چلا آ رہا ہے۔ بمبئی کا جناح ہال اگر اس نے بنوایا ہے اور اس کے شاندار کارناموں کا اس سے موزوں اعتراف ممکن ہی نہ تھا۔ ملک سے روٹھ کر، قوم سے مایوس ہو کر، ترک وطن کر کے لندن میں جا بسا ہے لیکن آج کل خوش قسمتی سے بمبئی میں موجود ہے۔ کیوں نہ اس سے رجوع کیا جائے۔ بے شک وہ عوامی لیڈر نہیں ہے۔ لیکن اس کی آن، اس کے بانکپن، اس کے اخلاص اور اس کے بے لوث جذبۂ حریت کے خواص بھی زبانِ سنج ہیں اور عوام بھی وہ اگر راضی کر لیا گیا تو پھر ہمیں دوسری مسلمان جماعتوں کے اختلاف کی پرواہ نہ ہوگی۔ ہمارا کاروان منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہے گا یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔

مسز نائیڈو کے منہ سے نکلی ہوئی یہ بات بہت جلد مطالبہ بن گئی کچھ دن کے بعد بابو راجندر پرشاد مسٹر جناح کے دولت کدے پر دستک دیتے نظر آئے۔

قائدِ اعظم نے تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ ارجن بابو کا خیر مقدم کیا دونوں میں مفاہمت اور مصالحت کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کئی سال پہلے قائدِ اعظم نے مسلمانوں کے کم از کم مطالبات کانگریس کے سامنے پیش کیے تھے، جو چودہ نکات کے نام سے تاریخِ سیاست ہند میں اب

"کانگریس آپ کے تمام مطالبات و شرائط تسلیم کر لے گی۔ اگر ہندو مہاسبھا بھی انہیں مان لے۔"!

اس فصیح و بلیغ جواب نے مسٹر جناح کو واقعی لاجواب کر دیا۔ شاید یہ ان کی زندگی کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو لاجواب محسوس کیا۔ انہوں نے صدر کانگریس سے گفتگو یہ سمجھ کر کی تھی کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے۔ لیکن اس جماعت کے صدر نے خود اعتراف کر لیا کہ اصل طاقت کانگریس کے ہاتھ میں نہیں مہاسبھا کے ہاتھ میں ہے۔ مہاسبھا کانگریس کے کیے ہوئے سمجھوتے کو رد کر سکتی ہے۔ لیکن کانگریس مہاسبھا کے فیصلے کو مسترد نہیں کر سکتی!

نتیجہ یہ ہوا کہ راجن بابو پٹنہ واپس چلے گئے اور مسٹر جناح لندن!

"عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا"۔!

"اچھا جنون۔ عشق کا بیمار ہو چکا"۔!

(اگست ۱۹۶۱ء)

کا ہر شخص معترف تھا لیکن بدقسمتی سے یہ ساری چیزیں کہیں زیادہ افراط کے ساتھ ان کے حریف مقابل میں بھی موجود تھیں بلکہ ایک فرق تھا فرق یہ تھا کہ راجن بابو اپنے مسلک کی تائید میں اتنی پُرزور ناقابلِ شکست اور زبردست دلیلیں نہیں پیش کر سکتے تھے، جن کا خزانہ قائدِ اعظم کے پاس موجود تھا، راجن بابو اس منطقی طرزِ استدلال سے تہی دامن تھے جس نے مسٹر جناح کو بامِ رفعت پر پہنچا دیا۔ یہی مسٹر جناح تھے جن کے بارے میں لارڈ مارلے وزیرِ ہند نے اپنی ڈائری میں آج سے پندرہ بیس برس پہلے لکھا تھا:۔

"مسٹر جناح نے ہمیں مسفورڈ (لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے آف انڈیا) کو اپنے دلائل کے شکنجے میں اس طرح کس لیا جس طرح مکڑی اپنے جالے میں مکھی کو جکڑ لیتی ہے ان کی حالت قابلِ رحم تھی ۔ حقیقت ہے کہ ایسے دل و دماغ کا شخص اپنے ملک کے انتظام میں کوئی حصہ نہ رکھتا ہو!"

آج مسٹر جناح کے سامنے لارڈ چیمسفورڈ کی بجائے راجندر پرشاد تھے۔ یہ اپنے حریف کے سامنے اتنی دیر بھی نہ ٹھہر سکے جتنی دیر ایک غیر ملکی وائسرائے ٹھہر سکا تھا۔ ان کی حالت اس سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی!

کئی گھنٹے کی گفت و شنید کے بعد صورتِ حال یہ تھی کہ مسٹر جناح کے دلائل اپنی جگہ ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ کی طرح قائم تھے اور راجندر پرشاد کے حصار بلا بین کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔۔!

لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلنا چاہیے تھا۔ اسے کسی بات پر پہنچ کر ہی ختم ہونا چاہیے تھا!

آخر راجندر بابو نے وہ نکتہ پیدا کیا جو ہندوستان کی تاریخ سیاست میں خواہ زریں حروف میں لکھا جائے یا سیاہ حروف میں۔ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

راجن بابو نے فرمایا:

لگایا انہیں اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ انہیں کافر کہا گیا، انہیں ہندو نواز کے خطاب سے مخاطب کیا گیا، ان کی آواز سنی ان سنی کر دی گئی۔ ان کی توہین و تذلیل کی گئی لیکن وہ اپنے جادۂ صواب پر گامزن رہے۔

ان رہنماؤں میں علی برادران پیش پیش تھے۔ وہ آزادی کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے۔ وہ اپنی قوم کو برابر یہی تلقین کرتے تھے کہ پہلے اس دشمن کا مقابلہ کرو جو مسلمانوں کا نہیں اسلام کا دشمن ہے اور جس کی اسلام دشمنی پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں جو آج بھی عراق پر قابض ہے، مصر پر قابض ہے، عدن پر قابض ہے اور ہندوستان پر قابض ہے اور جب تک ہندوستان پر اس کا قبضہ ہے، نہ مصر آزاد ہو سکتا ہے اور نہ عراق عالم اسلام اس کے دست ظلم سے اسی وقت نجات پا سکتا ہے جب ہندوستان آزاد ہو جائے۔ لہٰذا ہمیں ساری کوششیں انگریزوں کے استیصال پر صرف کرنی چاہئیں۔ ہندوؤں سے تو ہر وقت نمٹا جا سکتا ہے۔

۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ مرتب ہوئی اس رپورٹ نے علی برادران کو بھی مایوس کر دیا۔

انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہندوؤں کی نیت بخیر نہیں ہے اس رپورٹ میں مسلمانوں کے معمولی مطالبات بھی مسترد کر دیے گئے۔ مسلم رہنماؤں اور جماعت کی طرف سے جو ترمیم پیش کی گئیں بھی مسترد کر دی گئیں۔ حد یہ ہے کہ مسٹر چھاگلا (سابق سفیر ہند دستان) تک کی ترمیم پر موتی لال نہرو نے غور کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے گاندھی جی سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ رپورٹ یا تو بجنسہٖ منظور کی جائے ورنہ مسترد کر دی جائے اور اگر مسترد کر دی گئی تو میں کانگریس کے پنڈال میں بھی کبھی قدم نہیں رکھوں گا۔ یہ دھمکی کام کر گئی۔ گاندھی جی نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں تک کہ سر تیج بہادر سپرو جیسے غیر متعصب اور معتدل ہندو نے جو ترمیمیں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے پیش کیں وہ بھی نامنظور کر دی گئیں۔

مولانا محمد علی کا آخری سفر لندن

ہندوستان ابھی تک غلام تھا، آزادی کی جد وجہد جاری تھی، ہندو اور مسلمان دوش بدوش جنگِ حریت لڑ رہے تھے۔ اس راہ میں شدائد و مصائب کا مقابلہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے تناسب سے کہیں زیادہ دلیری اور جرأت کے ساتھ کیا۔ نہ فوج کی گولیاں ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کر سکیں اور نہ پولیس کا لاٹھی چارج ان کے عزائم میں تزلزل پیدا کر سکا۔

لیکن عین اُس وقت جبکہ آزادی کی منزل قریب تر ہوتی جا رہی تھی ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کر دی اور یہ تحریک شروع کرنے والے سوامی شردھانند تھے جو جنگ آزادی کے ایک سپاہی اور کانگریس کے زبردست نقیب تھے۔ جواب میں مسلمانوں کی طرف سے تبلیغ و تنظیم کے نام سے دو تحریکیں شروع ہوئیں۔ تبلیغ کے علمبردار خواجہ حسن نظامی اور میر غلام بھیک نیرنگ تھے تنظیم کے رہبر مختار ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔

ان تحریکوں نے آزادی کی تحریک کو دبا دیا۔ مسلمانوں میں تبلیغ و تنظیم کا بول بالا تھا۔ ہندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن کا کانگریس کے لیڈر دیکھ کر بیٹھ گئے اور گاندھی جی نے تو باقاعدہ اعلان کر دیا کہ اب اُن کی کوئی نہیں سنتا اور ایک چھٹے ہوئے کارکن کی حیثیت رکھتے۔

لیکن مسلمان رہنماؤں نے یہ وطیرہ اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی قوم سے بلند اور بالا اعلان مطالبہ کیا کہ تبلیغ و تنظیم کا صحیح وقت وہ ہوگا جب ہندوستان آزاد ہو جائیگا۔ فی الحال ساری توجہ حصولِ آزادی پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ جن مسلمان لیڈروں نے یہ نعرہ

روانہ ہو رہے تھے۔

مولانا کے بمبئی پہنچنے کے بعد ایک زبردست طوفان برپا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ علی برادران اور کانگریس کے مابین سنگین اور شدید نوعیت کے اختلافات ایک عرصے سے چلے آ رہے تھے لیکن "توت" کا مظاہرہ اب تک نہیں ہوا تھا۔ مولانا محمد علی کے مجوزہ سفر نے یہ موقع پیدا کر دیا۔

بمبئی کانگریس تحریک کا سب سے بڑا اور ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا۔ ہندوستان کے کئی شہروں میں کانگریس کو وہ عروج، وہ اقتدار، وہ دبدبہ نہیں حاصل تھا جو بمبئی میں حاصل تھا۔ یہاں کے سرمایہ دار اور غریب مالکانِ مل اور مل مزدور گجراتی اور مرہٹے، سب گاندھی جی کا کلمہ پڑھتے تھے، کانگریس کے گن گاتے تھے اور کانگریس کے نام پر ہر قربانی کے لیے تیار رہتے تھے، خواہ وہ قربانی جان و زندگی سے تعلق رکھتی ہو یا مال و زر سے۔ بمبئی کے کانگریسی رہنماؤں اور کارکنوں نے ایک پرائیویٹ اجتماع میں طے کیا کہ اس سے بڑھ کر گاندھی جی کی کانگریس کی اور بمبئی کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ گول میز کانفرنس میں جس کا گاندھی جی اور کانگریس نے بائیکاٹ کر رکھا ہے، مندوب کی حیثیت سے اس میں شرکت کے لیے مولانا محمد علی نعرہ ہائے تکبیر کے جلوس میں روانہ ہو جائیں اور کوئی طوفان برپا نہ ہو: طوفان برپا ہونا چاہیے، طوفان برپا ہوگا۔ محمد علی کو بائکلہ سے بیلارڈ پیر تک کالی جھنڈیوں اور مردہ باد کے نعروں کے جلوس میں روانہ ہونا پڑے گا۔ بمبئی کے باشندے ان پر ثابت کر دیں گے کہ ملک کے ایک غدار کو کس طرح الوداع کہا جاتا ہے۔

آناً فاناً یہ خبر سارے شہر میں مشتہر ہو گئی!

بمبئی اگر کانگریس کا مرکز تھا تو مجلس خلافت کا مرکز بھی تھا، یہاں اگر کانگریس کے سپاہی رضاکار اور رزم شعار بستے تھے تو خلافت کے فدائی، جاں نثار اور رزم خواہ بھی آباد تھے، وہ اپنے زعیمِ کبیر کی یہ توہین کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟

پنڈت نہرو کی اس روش کو دیکھ کر مولانا محمد علی پکار اٹھے۔

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے کہ کوئی منزل تو نہیں ہے

محمد علی کانگریس سے باہر نکل آئے، اور پھر مسلمان من حیث القوم کبھی بھی کانگر
کا ساتھ نہ دے سکے۔

دن گزرتے رہے، ماہ و سال کی تقویم بدلتی رہی یہاں تک کہ لارڈ ارون وا
ہند نے لندن میں ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا۔

گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں کو
اس سے کہ وہ کسی جماعت سے وابستہ ہوں شرکت کی دعوت دی گئی۔ کانگریس
مطالبہ کیا کہ کانفرنس میں اس کی اکثریت ہونی چاہیے۔ حکومت برطانیہ نے اس مطا
ماننے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ لیکن دوسری جماعتوں نے شر
پر آمادگی ظاہر کی۔ مسز نائیڈو اگرچہ کانگریس کی سابق صدر کانگریس مجلس عاملہ کی ر
اور مسلک کے اعتبار سے کٹر کانگریسی تھیں، لیکن خواتین ہند کی نمائندگی کے لیے انہیں او
شاہنواز کو نامزد کیا گیا۔ دونوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ مولانا محمد علی کو بھی دعوت نامہ
وہ سخت بیمار تھے ذیابیطس حد کمال کو پہنچ چکا تھا۔ بلڈ پریشر بھی مستقل طور پر رہتے
تھا۔ قلب کی شکایت بھی شدید ہو چکی تھی۔ لیکن دستور ہند کی تشکیل کے موقع پر
تعلق نہیں رہنا چاہیے تھے۔ لہٰذا ڈاکٹروں کی نا نصیحت کے باوجود انہوں نے لند
کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا دریابادی نے لکھا، کاش محمد علی کو لندن نہ جانا پڑتا۔ لندن محمد
آجاتا۔"

جس جہاز پر مولانا کی روانگی طے پائی اس کا نام تھا "اسٹریٹ آف انڈیا"
اینڈ او کمپنی کا نہایت شاندار جہاز تھا۔ گول میز کانفرنس کے کئی اور بھی مندوبین اس جہا

ایک فرعون مزاج انگریز

انگریزوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان پر اصلی حکومت اس طبقہ کی تھی جو "آئی سی ایس" کہلاتا تھا۔ انڈین سول سروس کے ہر ممبر کو، کوئی شبہ نہیں ذہانت و فطانت میں، فکر و تدبر میں، نظم و انصرام میں، قابلیت اور نکتہ رسی میں طاق ہوتے تھے۔ ان کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جس کام پر لگا دیجیے اس طرح انجام دیں گے۔ ایسی قابلیت اور ایسی مہارت کے ساتھ کہ گویا قدرت نے اسی کام کے لیے انہیں تخلیق کیا تھا!

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ اس طبقہ میں ایک بہت بڑا عیب بھی تھا، نخوت، رعونت، پندار اور فرعونیت کا یہ پیکر تھا۔ یہ سمجھتا تھا اور شاید ایک حد تک بجا طور پر صحیح سمجھتا تھا کہ ہندوستان کی قسمت اس کے ہاتھ میں ہے، یہ اسے بنا اور بگاڑ سکتا ہے۔ عوام کے ساتھ اس کا برتاؤ ایک سنگدل آقا اور مظلوم غلام کا تھا، ماتحتوں کے ساتھ اس کا سلوک، بندۂ و خواجہ کا تھا۔ زیر دستوں سے یہ اس طرح پیش آتا تھا جس طرح ایک فاتح اور کشور کشا کسی مفتوح کے ساتھ پیش آتا ہے، یہی وجہ تھی کہ اس طبقہ کے خلاف جہاں دلوں میں نفرت تھی وہاں آدمیوں پر دہشت بھی تھی، بڑے بڑے با اثر باقتدار، رئیس اعظم، اور امیر کبیر اس کے درِ دولت پر جاتے ہوئے "نزلہ بار یا حفیظ" کا ورد پہلے کر لیتے تھے۔

لیکن ہر کلیہ میں ایک استثنا بھی ہوتا ہے، عام طور پر اس طبقہ کے لوگ جہاں بدخو، بدنہاد، اور بد سرشت ہوتے تھے۔ عام اس سے کہ وہ انگریز ہوں یا ہندوستانی

عمر کھاڑی کے میدان میں مسلمانانِ بمبئی کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں پیغمبر اسلام مولانا شوکت علی نے ایک معرکۃ الآرا تقریر ارشاد فرمائی انہوں نے کہا

"میں اس پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ محمد علی وائسرائے آف انڈیا جہاز سے لندن روانہ ہو رہا ہے، اس کا یہ فیصلہ اٹل ہے دنیا کی کوئی طاقت اس فیصلے میں تبدیلی نہیں کر سکتی، وہ یہاں سے ایک ہیرو کی طرح رخصت ہوگا۔ مسلمانانِ بمبئی کا جلوس اسے الوداع کہنے کے لیے ساحل سمندر تک جائے گا۔ ہم جنگ نہیں چاہتے، ہم بدامنی نہیں چاہتے۔ ہم کشت و خون نہیں چاہتے، ہم فتنہ و فساد نہیں چاہتے۔ لیکن اگر جنگ ہم پر مسلط کر دی جائے تو ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ ہماری طرف سے پہل نہیں ہوگی، جو میں بتا دینا چاہتا ہوں بمبئی سے صرف محمد علی ہی نہیں روانہ ہو رہا ہے، کانگریس کے لیڈر بھی یہاں آتے ہیں اور یورپ کے دورے پر روانہ ہوتے رہتے ہیں انہیں بھی اتنے ہی شاندار طریقہ پر الوداع کہنے کے لیے مسلمان موجود ہوں گے جس طرح وہ محمد علی کو رخصت کرنا چاہتے ہیں۔"

جلسہ ختم ہو گیا، دوسرے روز ہزارہا مسلمانوں کے جلوس میں مولانا محمد علی اپنے رفقا عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بیلا۔ ڈ پیر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن کئی میل کے اس طویل راستے میں نہ کہیں مردہ باد کا نعرہ سنائی دیا، نہ کالی جھنڈی نظر آئی۔ مولانا شوکت علی کو جب اس طرف توجہ دلائی گئی تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا:

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا!

(اگست ۱۹۶۱ء)

اتر جائیے۔ صاحب ویسے ہی بڑے نازک مزاج ہیں اور اس وقت تو کسی بات پر غصہ میں بھرے بیٹھے ہیں۔ شمشیر خاں نے کڑک کر کہا۔

"بھاگ جاؤ!"

وہ چلا گیا، اب ان کا گھوڑا اور زیادہ قریب پہنچ گیا۔ آوازِ سم اور زیادہ بارِ سماعت ہونے لگی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے تلملا کر چپراسی سے فرمایا:

"کون ہے، حاضر کرو!"

چپراسی کے دل میں شمشیر بہادر کی عزت تھی، احترام تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا آیا اس نے عرض کیا۔

"صاحب نے سلام بولا ہے۔ — حضور اب بھی چلے جائیے، میں کہہ دوں گا، وہ گھوڑے پر تھے، بہت دور نکل گئے!"

شمشیر بہادر گھوڑے سے اتر پڑے، مسکرا کر — لیکن اس تبسم میں کتنی بجلیاں پوشیدہ تھیں اس بیچارے کو کیا معلوم؟ — جواب دیا۔

"صاحب نے سلام بولا ہے تو ان سے بغیر ملے ہم کیسے جا سکتے ہیں؟"

چپراسی کا خون خشک ہو گیا، لیکن جواب کیا دیتا خاموش ہو رہا۔ سمجھ گیا آج یہ میرے ہاتھ سے مار کھائیں گے!

شمشیر بہادر نے چپراسی سے کہا۔

"تم اس گھوڑے کو سنبھالو۔ ہم تمہارے صاحب سے مل کر آتے ہیں!"

چپراسی کراہی چاند اور ملازمت دونوں عزیز تھیں اور پھر شمشیر بہادر کے ساتھ اندر جا کر صاحب کے حکم سے انہیں پٹتا بھی دیکھ سکتا تھا وہ بھلا گھوڑے کی لگام تھامے کیسے گزارہ سکتا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"حضور مجھے بھی آپ کے ساتھ ہی ساتھ واپس بلایا ہے!"

بلکہ ہندوستانی اور زیادہ — وہاں کچھ ہستیاں اس طبقہ میں ایسی بھی نکل آتی تھیں
دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرتی تھیں، مصیبت میں کام آتی تھیں اور جسے
دوست اور وفادار سمجھ لیں، اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں
جادۂ آئین و قانون سے ہٹ کر بھی اور ان میں اتنی ہمت ہوتی تھی کہ اپنی بات
سے بڑی عدالت مرافعہ سے اپنے زورِ قلم حسنِ استدلال اور مہارت آئین کے باعث
منوالیں۔

میں نے آئی سی ایس طبقہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی ایک مثال پیش
کروں گا۔ اچو سلامتی طبع کی ہے۔

ضلع سیتاپور کا ایک انگریز ڈپٹی کمشنر جس کا نام اس وقت بھول رہا ہوں
درجہ فرعون صفت واقع ہوا تھا اس کی بدمزاجی کا یہ عالم تھا کہ کسی بڑی سے بڑی
کو اجازت نہیں تھی کہ اس کے کمرہ کے سامنے سے اس طرح سے گزر سکے کہ چاپ
ہو سکے۔ اگر وہ کسی کی آواز سن لیتا تو فوراً چپراسی کے ذریعہ اپنے حضور میں طلب
اور اس گستاخی پر پٹوا دیتا۔ وکیل، بیرسٹر، رئیس، امیر، راجہ، نواب سب ہی اس
بید لرزاں کی طرح کانپتے تھے۔ ایک دن ایک چھوٹے سے تعلقہ کے مالک شمشیر بہادر
اپنے مشکی گھوڑے پر ادھر سے گزرے۔ صاحب جاہ و دولت ہونے کے باوجود
نہایت شریف، شمع، منکسر المزاج اور مرنجاں مرنج شخص تھے جس کے باعث ہر
جاننے والا ان کا ادب و احترام کرتا تھا۔

ایک بار وہ سیتاپور اپنے علاقہ بہادر پور سے آئے۔ سواری میں مشکی گھوڑا
گھوڑے کی سم کی آواز انسان کی آواز پا سے کہیں زیادہ سامعہ خراش ہوتی ہے جب
ڈپٹی کمشنر بہادر کی طرف سے گزرنے لگے تو وہی چپراسی جو نہ جانے اپنے آقا کا حکم پا کر
کتنوں کو پیٹ چکا تھا، ڈرتا ہوا آیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض پیرا ہوا کہ حضور گھوڑے سے

"تم ہمارا قاعدہ نہیں جانتا؟"

شمشیر بہادر نے اسی سنجیدگی اور ملائمت کے ساتھ جواب دیا۔

"جانتا ہوں۔ بہت دنوں سے سن رہا ہوں اس قاعدے کو، اور اس قاعدے کی خلاف ورزی کرنے والوں کا حشر بھی مجھے معلوم ہے!"

یہ باتیں سن کر تو صاحب بہادر آگ بگولہ ہو گئے انہوں نے اسی چپراسی سے ارشاد فرمایا:

"ویل اس آدمی کو درست کرنا، مانگتا!"

یعنی مطلب یہ کہ اب اسے خوب اچھی طرح پیٹو!

صاحب بہادر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے اور ابھی چپراسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی تھی کہ دفعتہً شمشیر بہادر نے بغل میں دبا ہوا چھوٹا سا چمڑی کوڑا جو نہایت مضبوط تھا نکالا اور دو قدم آگے بڑھ کر صاحب بہادر کے تن نازک پر تڑاتڑ برسانا شروع کر دیا۔ منہ پر، ہاتھ پر، کمر پر، سر پر، بازو پر، شانے پر، گردن پر، ناک پر ہر جگہ بجلی کی طرح شمشیر بہادر کا کوڑا کوند رہا تھا۔ حاضرین کا یہ عالم کہ سب پر کیفیت مرگ طاری تھی۔ یہ اتنا غیر متوقع، اچانک اور ناقابل یقین حادثہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے نفس کی آمد و شد رک گئی ہے سب کی۔

اپنا کام کر کے شمشیر بہادر نہایت اطمینان سے باہر نکلے، گھوڑے پر بیٹھے اور یہ ممبر بادا نہیں اپنی پیٹھ پر لے کر بہادر پور روانہ ہو گیا۔ — کسی میں اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ انہیں روکتا۔ کچھ ان کی شخصیت کی وجہ سے اور زیادہ تر اس حادثہ کی بوالعجبی کے باعث!

شمشیر بہادر کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے لیکن وہ اپنی ماں، بیوی اور خاندانی جواہرات اور اثریاں لے کر جانے کہاں — شاید کسی ریاست میں پہنچ چکے

شمشیر بہادر ہنس پڑے، انہوں نے سامنے کے درخت کی ایک شاخ سے لگام لٹکا دی اور زیر خند کرتے ہوئے فرمایا۔

"ہم سے اٹھتے ہو اُستاد، کیوں بلایا ہے صاحب نے تمہیں؟ ہمیں پٹوانے کے لیے؟ اچھا چلو یہ حسرت بھی پوری کر لو!"

وہ لرز گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"حضور میں تو غلام ہوں بس غلام!"

شمشیر بہادر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"ہاں ہاں ہم جانتے ہیں!"

چپراسی کے ساتھ ساتھ شمشیر بہادر صاحب کے دربار خاص میں پہنچے وہ اس وقت سررشتہ دار کو کچھ نوٹ لکھا رہے تھے، دو اردلی بھی دست بستہ حاضر تھے۔ پر سناٹا چھایا ہوا تھا، سوئی بھی اگر گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ صاحب نے سررشتہ دار کی طرف سے منہ موڑ کر شمشیر بہادر پر ایک نظر ڈالی، بلند و بالا قد، بھرا ہوا جسم بڑی بڑی مونچھیں، سیاہ اور گھنی ہوئی داڑھی، نہایت اعلیٰ درجہ کا قیمتی لباس زیب بدن۔ شاید وہ سوچنے لگے اتنے وجیہ آدمی کو پٹوانا مناسب ہے یا نہیں؟ پھر انہوں نے سوچا ہوگا جو روایت قائم کر دی گئی ہے وہ ایک مرتبہ ٹوٹی تو ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گی چنانچہ شمشیر بہادر کی وجاہت شفیع نہ بن سکی۔ تھوڑے توقف اور تامل کے بعد بگڑتے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

"ویل تم تھا؟"

شمشیر بہادر نے سر جھکا کر عرض کیا۔

"جی حضور میں تھا!"

صاحب بہادر نے گرج کر پوچھا:۔

۵۰ برس پہلے کا سیاسی ہندوستان

*

علی برادران کی نظر بندی

*

اُمّ الاحرار آبادی بیگم

*

جب آزادیٔ ہند کے معرکہ میں مسلمان ہندوؤں سے بڑھ گئے تھے

*

تحریکِ خلافت کا دور

*

نصف صدی پہلے کی تاریخ کے اوراق گم شدہ

تھے اور صاحب بہادر کی رسائی سے بہت دور اور بہت آگے نکل گئے تھے۔ انتقام اور
سزا کے طور پر ان کا علاقہ ضبط کر لیا گیا۔ جاگیر پر بل چلا دیے گئے، سامان منقولہ اور غیر
منقولہ کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا گیا۔ لیکن شمشیر بہادر ہاتھ سے نکل چکے تھے اور زبان
حال سے یہ کہتے ہوئے نکل چکے تھے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جھٹکے میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

شمشیر بہادر کا پتہ نہ چلا لیکن اس حادثہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر اگر ڈپٹی کمشنر صاحب
کے کمرے کے سامنے باجے اور تاشے بھی بجتے تو بھی ان کے سکون میں خلل نہ پڑتا۔

ہے اور خط کا مضمون وہ ہے جو آج سب کے دلوں میں ابھرا ہے۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں
پرانے لوگ اور خصوصاً بوڑھی عورتیں عموماً ایسی ردوبدل کی خواہاں نہیں، لیکن گو میں
ضعیفہ ہوں لیکن ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی ہوں، جو آج ہمارے اردگرد وقوع میں آرہی
ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے ملک کے ایسے اشخاص کو دیکھ کر بہت خوش ہوں جو اب
ان ہی اعتقادات کے پابند ہوتے جاتے ہیں جن کے جوش میں پہلے بزرگوں نے، ہم اور
انسب کام کیے تھے اور اس لیے بھی خوش ہوں کہ ہم مسلمان آخرکار اس قدیم اور پاک اصول
کی طرف جھک رہے ہیں، جس کا نام اسلام ہے۔ اپنے پیغمبر پرنور صلی اللہ علیہ وسلم، کے
شاندار زمانہ میں اور آپ کے خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کے عہد میں ہم بھلائی
کرنے کے لیے بالکل آزاد تھے اور عورتیں بھی مردوں کا ساتھ دیتی تھیں اور جہاد تک
میں شریک ہوتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ زمانہ حال میں ہم بہت ہی تنہائی میں اوقات گزار
رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی میں نہیں خیال کرتی کہ عورتیں اس ادائے فرض سے
جس کا زمانہ متقاضی ہوگا جھجکیں گی۔ اپنا حال یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے میرے حصہ
میں وہ کام جو عموماً عورتوں کو نہیں دیا جاتا، رکھ دیے ہیں۔

میرے خاوند کی اچانک اور قبل از وقت موت نے مجھے ۲۷ برس کی عمر میں بیوہ
بنا دیا۔ اس وقت میرے چھ بچے تھے (جن میں محمد علی سب سے چھوٹا اور دو برس کا تھا)
ان کی تعلیم میرے ذمہ ہوئی۔ ماسوا اس کے ان کی ملکیت کی نگہبانی میرے سر پڑی۔ خدا
کی مدد پر پورا بھروسہ کرکے جو نیک کام کرنے والوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے اعتقاد
ومذہب پر یقین رکھ کر میں کام کرنے لگی۔ اور باوجود تکالیف ومشکلات کے مجھے اس
کا صلہ مل گیا یعنی ہماری کل اولاد مسن ہوکر اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ اب نہیں
میرا کوئی کار نہ تھا اور اس بیچ میں ان مذہبی عبادات کی طرف مشغول ہوگئی تھی جن کی
طرف میں ہمیشہ مائل رہا کرتی تھی۔ لیکن جب میرے دو سب سے چھوٹے لڑکے شوکت علی

ام الاحرار بی اماں کا خط

حیات اسلامیہ کی گم شدہ تاریخ کا پرانا ورق

"حسب ذیل خط ام الاحرار یعنی مولانا شوکت علی مولانا محمد علی کی والدہ محترمہ نے جو بی اماں کے نام سے مشہور تھیں، مشہور محب وطن مسز سروجنی نائیڈو پریسیڈنٹ ہوم رول لیگ مدراس کے نام اس وقت روانہ کیا تھا جبکہ ہندوستان کا سیاسی مطلع مسز بیسنٹ کی نظربندی سے نہایت غبار آلود ہو رہا تھا مسز سروجنی نائیڈو نے اسکو اس عظیم الشان جلسہ میں پڑھ کر سنایا جو مسز بیسنٹ کی نظربندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مدراس میں منعقد ہوا تھا۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب مسز سروجنی نائیڈو مجھے خوف ہے کہ یہ خط آپ کو متعجب نہ کر دے اس وجہ سے کہ یہ ایک محض اجنبی شخص کا خط ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ راقمہ ایک مسلمان عورت ہے جس کی پرورش پرانی وضع کے مطابق ہوئی ہے جس کے مطابق عورتیں اجنبی سے بہت کم مخاطب کرتی ہیں اور مردوں سے تو کبھی نہیں کرتیں لیکن اب زمانہ عجیب ہے، اور اتنی تیزی سے بدل رہا ہے کہ مجھ جیسی ضعیفہ کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ آں محترم کو خط لکھ کر روایات قدیم کو توڑ دے گی۔

ڈکوں کو ان کی نظربندی کے زمانہ میں لکھا کرتی تھیں۔ یہ خواہش اور بھی زیادہ ہو گئی محمد حمیرے لڑکوں پر بہت ہی عنایت اور شفقت کرتی تھیں اور ان کو اپنی تمام تصانیف بھیجا کرتی تھیں۔ مہربانی فرما کر میرا سچا پیام محبت ان تک پہنچا دیجیے اور میری طرف سے ان کو یقین دلا دیجیے کہ ہمیں ان سے اور ان کے دونوں رفقا سے نہایت گہرا تعلق خاطر ہے۔

یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں کبھی مسز بسنٹ سے مل نہ سکی میرا بیٹا شوکت علی چند برس بنارس میں رہا جہاں وہ افیون کے محکمہ میں سرکاری افسر تھا۔ گو میں تقریباً ہر مقام میں جہاں وہ جاتا اس کے ساتھ ہوتی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بنارس ہی میں ساتھ نہ رہی۔ بہرکیف خدا چاہے تو کسی نہ کسی دن ان سے مل لوں گی اور اس اثنا میں ان کے حق میں دعا کرتی رہوں گی۔ ان کی نظربندی میں سوائے مبارکبادیوں کے اور کوئی تحفہ نہیں بھیج سکتی۔ متحدہ ہندوستان میں نوجوان بوڑھے، ہندو اور مسلمان سب کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں یہ دعائیں ان سختیوں کی تلافی ہوں گی جو ادنیٰ لوگوں کی ایک چھوٹی جماعت سے انہیں مل رہی ہیں اور سختیاں بھی ان ۲۷ مہینوں سے نصیب ہو رہی ہیں۔ دعاؤں اور مبارکبادیوں کے ماسوا ان کی نذر کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ نظربندی کے متعلق جو فنڈ کھولا گیا ہے اس میں بھی تھوڑا بہت جو کچھ ہو سکتا ہے چندہ دوں۔ ہم لوگ کبھی متمول نہیں رہے ہیں بلکہ میرے بیٹے جب سے نظربند ہوئے ہم اور بھی غریب ہو گئے ہیں۔ ان میں کوئی اس قابل نہیں کہ کسی قسم کا کاروبار کرے۔ بخلاف اس کے کہ ہر سال صرف قرض کے لیے ہزاروں روپیہ کا سود بھرنا پڑتا ہے۔ ان مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے اور ایک بڑے خاندان کے روزانہ خرچ کے لیے جس کی کفالت کو ہمارے بیٹوں کی تنخواہ کافی نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنی جاگیر کا بہت بڑا حصہ فروخت کر ڈالا۔ میرا اگر میرے شوہر کی کمائی تھی وہ اس طرح کہ غدر میں

اور محمد علی دو برس سے زیادہ ہوئے کہ نظربند کیے گئے تو میں نے محسوس کیا کہ
جوان ہیں اور اہل و عیال والے ہوگئے ہیں تاہم مجھے اُن کے پاس رہنا چاہیے ان
بے وجہ نظربندی کے پہلے دن ہیں ان کی جبریہ تارک الوطنی ہیں شریک ہوں اور ایسا
پر جی نہیں بچتاتی۔ یہ صرف ایک عزت ان ہی لوگوں کے لیے ہے جن کو خدا اپنے
اور اپنے ملک کی خاطر تکالیف برداشت کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے اور میں کافی
زیادہ مطمئن ہوں کہ میرے بیٹے سب سے پہلے قانون تحفظ ہند کے تحت نظربند
جبکہ قانون کو پاس ہوئے مشکل سے دو مہینے گزرے تھے۔ اپنی مرضی سے اپنے
کی خواہش کے خلاف میں نے ان کی تکالیف و مصائب میں شریک ہونے کا فیصلہ
تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ جو کچھ مجھ جیسی ضعیف العمر عورت خدا اور اپنے ملک
لیے کر سکتی ہے کروں گی ہوم رول کے متعلق میں نے اپنی ہی صنف اور اپنی ہم عمر
بیسنٹ، کو اس قدر انہماک کے ساتھ کام کرنا قدرتی میلانات کے ساتھ دیکھا اور
کہہ سکتی ہوں کہ گذشتہ چالیس سال سے میں بھی عملی طور پر ہوم رولر رہی ہوں اور
نتائج حاصل ہوئے ان کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتی ہوں کہ میری کوششیں بیکار نہیں گئیں

اس لیے میں محسوس کرتی ہوں کہ اپنے ملک کے لیے ہوم رول کے مطالبہ
کرنے کا حق میں نے حاصل کر لیا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ گو میں صوبۂ متوسط میں رہ
ہوں تاہم مہاراشٹرا ہوم رول لیگ میں جس کو اس بہادر اور زیرک شخص یعنی لوکمانیہ
تلک نے قائم کیا ہے شامل ہو سکتی ہوں تو میں نے مع اپنی بہو (یعنی محمد علی کی بیوی)
اور اپنے گھر کے تمام دوسرے لوگوں کے اس لیگ کی ممبری کا حلف لے لیا۔ اس
زمانہ میں محض عقائد کافی نہیں، اب تو اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے
کا باآواز بلند اعلان کرے مجھے ہمیشہ اپنی قابل اور بہادر بہن اینی بیسنٹ سے ملنے
کی خواہش رہی ہے اور ان کے ان محبت آمیز اور ہمت افزا خطوط کے بعد جو وہ

اس کے سوا دو برس کے ذاتی تجربے سے ہمیں صریحاً معلوم ہو گیا ہے کہ وہ سینکڑوں بیبیاں جن کے گھر تباہ ہو گئے ہیں۔ آج کیا خیال کرتی ہوں گی اور اس سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ نوجوان کیا خیال کرتے ہوں گے جن کی نگہبانی کو اور جن کے ساتھ جلاوطنی میں ہمدردی کے لیے مائیں موجود نہیں۔ غم اور فاقہ کشی کی داستان پر اکثر سنی جاتی ہے۔ اور کتنے ایسے پُردرد افسانے ہیں جو کانوں تک پہنچتے رہتے ہیں۔ کیا ان کو قانونی رائے اور مالی امداد دینے کی کوئی ترکیب نہیں نکالی جا سکتی ہے۔

اگر یہ بدنصیب لوگ اپنی آزادی کھو بھی دیں تو وہ لوگ بھوکوں کیوں مریں جو اس سزا کے قابل کوئی جرم نہیں کرتے کیا ہمارے ہوم رول لیگ کی کمیٹیاں نہ صرف ان نظربندوں کی حالت کا جنہیں پبلک جانتی ہے بلکہ ہر نظربند کی حالت کا ایک ریکارڈ نہیں رکھ سکتیں اور ان کو ان کے متعلقین کو ضروری مدد نہیں دے سکتیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر اپیل کی جائے تو ہندوستان کے ہر حصہ کا ہر گھر اور مقدس اغراض کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دے گا خواہ وہ غلہ ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ ہماری فیاض اور بے لوث بہن اپنی بیسنٹ بیشک اس کی مستحق ہیں کہ ایسا فنڈ انہیں کے نام سے کھلے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ان کے مصائب اور احتیاج سے تمام ہندوستان متاثر ہو کر ان لوگوں کا بھی ویسا ہی خیال کرے جو ان کی طرح دکھ سہہ رہے ہیں تو مستورات بہت خوش ہوں گی۔ خود ان کی مصیبتیں کیسی ہی سخت کیوں نہ ہوں قابل برداشت ہو سکتی ہیں۔ عورتیں مردوں کی طرح کارگزاریاں نہیں کر سکتیں۔ مگر خدا نے اپنے رحم سے ہمارے دلوں میں محبت اور برداشت کی زیادہ سکت دی ہے۔ جہاں ہم زیادہ محبت کرتے ہیں وہاں زیادہ دکھ بھی سہتے ہیں اور خوشی سے بہ دن زیادہ نہیں ٹھہر سکتے ہیں اور ان کا انجام صرف ایک ہی ہو گا۔ میں اپنی کتاب مقدس کلام اللہ پاک پر جو دکھوں میں سب کے لیے سہارا ہیں پورا اعتقاد رکھتی ہوں

جب وہ نواب رامپور کی ملازمت کرتے تھے۔ تو روہیلکھنڈ اور کماؤں میں انھوں نے
بہت سے انگریز باشندوں اور افسروں کی جانیں بچائی تھیں جب تک ہمارے
بچے کمسن تھے اور ہمیں ان کی پرورش کرنی تھی۔ تب تک میں نے اس امر کو ایک بڑا
فرض سمجھا کہ اس جائداد کے کسی حصہ کو علیحدہ نہ کروں اور تنگ دستی کے باوجود اب تک
اس کا ایک ایکڑ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ گیا تھا لیکن چونکہ پوتوں کی نظر بندی نے ۱۹۱۷ء میں
اس جاگیر کی فروخت کا مطالبہ کیا، جو دادا نے ۱۸۵۷ء میں حاصل کی تھی۔ لہٰذا میں نے
اپنے کو اس فرض سے پاک سمجھ لیا۔ مجھے اس کا مطلق غم نہیں کہ میں نے اسے بیچ ڈالا
مستقبل تو اس کے لیے مجھے اپنے بیٹوں اور پوتوں کی جانب سے کوئی بدگمانی نہیں
میں اپنے مشرقی مثل پر پورا اعتقاد رکھتی ہوں یعنی ع

ملک خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست

اب بھی میری خواہش یہ ہے کہ ہماری عالی مرتبہ بہن ہماری جیب کی خبر لیں
اور میں نہایت مشکور ہوں گی۔ اگر آپ ہم سے دس روپیہ قبول فرمائیں گے پیسے بھیجنے
کے لیے میں نے ایک منی آرڈر روانہ کر دیا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بتا دوں کہ
یہاں ہمارے گھر کے ہر شخص نے اس رقم میں کچھ نہ کچھ دیا ہے۔ بچوں اور نوکروں تک
نے نہایت شوق سے اور بہ اصرار اپنے حصہ کی قلیل رقم اس رقم میں شامل کی ہے
اس کے متعلق میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔ میرے بیٹے نوجوان اور مضبوط ہیں
سارے ملک میں ان کے اتنے دوست احباب ہیں کہ وہ جو مدد چاہیں ان کو خوشی
ساتھ مل سکتی ہے۔ لیکن ماں کا دل خون روتا ہے اور یقیناً بہن بسینٹ کا دل بھی
ہو گا۔ ان سینکڑوں بہادر بدنصیب لڑکوں کے غم میں جو بغیر کسی شنوائی کے مجرم قرار
گئے۔ اپنے احباب اور خاندان سے علیحدہ کر دیے گئے اور اس آزادی سے محروم
کر دیے گئے جس کی بدولت وہ اپنے لیے اور اپنے گھر کے لیے معاش حاصل کر

ام الاحرار کا ایک اور اہم مکتوب

چھندواڑہ

۴ ستمبر ۴۱ء

مہربانمن سر سیزانجی ارز۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے دو مشفقانہ خطوں کا جواب اس قدر تاخیر سے دے رہی ہوں۔ دراصل میں کچھ عرصہ سے فکر میں تھی کہ آپ کو خط لکھ کر اپنی بہن کی تندرستی کی بابت دریافت کروں جس کی بابت میں نے بہت تشویشناک افواہیں سنی ہیں۔ میں اس کا اندازہ پورے طور پر کر سکتی ہوں کہ نظربندی مع ان تکالیف جسمانی و روحانی کے جو نظربندی کے لوازمات ہیں ان ایسی نحیف اور عادات رکھنے والی کے لیے کیا معنی رکھتی ہے کیونکہ میرے نزدیک تو نظربندی اُن سے کہیں کم عمر والے شخص کو بھی ختم کر دیتی۔ پھر بھی ان کو کسی طرح سے تندرست اور قوی رہنا چاہیے اور ان کو اپنی اس تمام قوت روحانی سے کام لینا چاہیے۔ اور میں جانتی ہوں کہ خدا نے اپنی عنایت و مہربانی سے ان کو بہت خیر تر قابل ایمان اور قوت روحانی بخشی ہے۔

اس زمانہ آزمائش میں یکا یک قرآن مجید کے مسلسل الفاظ میرے دماغ میں چکر کھاتے ہیں۔ یا ایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ کیسی بے مثل ترکیب ہے یعنی صبر اور دعا کا عمل! کس قدر تسلی بخش اور طاقتور الفاظ ہیں! مجھے پورا یقین ہے کہ ہماری بہن کو ہم سے کسی ایسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے اُن کا ایمان تو ہمیشہ ہی رہا

یعنی :-

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ خدا حافظ۔

آپ کی سچی بہن

دستخط :-

آبادی بیگم بانو عبدالعلی والدہ شوکت علی و محمد علی۔

بڑے بڑے جلسوں کی کارروائیاں بندے ماترم کے راگ سے شروع ہوتی ہیں اور وہی بہادر نوجوان بنگالی جو انہیں الفاظ کے زبان پر لانے سے سزائیں جھیلتے تھے - اب ان کو اپنے مقبول جنگی نعرے کی طرح جبکہ وہ ضرورت کے وقت مرنے مارنے کے لیے جاتے ہیں استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ کے واسطے اپنی قومیت کے دامن کو بدنام رہنے سے پاک کر دیتے ہیں، اس سے ان لوگوں کو جو زبردستی ہوم رول کا جھنڈا گاڑ دیتے ہیں سبق لینا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ ایک روز وہ یہ سبق سیکھیں گے. خدا کرے کہ وہ جلد اس سبق کو سیکھیں کیونکہ بقول ایک ایرانی شاعر کے -

ہر چہ دانا کند کند ناداں　　لیک بعد از خرابی بسیار -

مہربانی کر کے میری بہن سے کہہ دیجیے کہ گو میں پیغمبر یا نجومی نہیں ہوں تاہم مجھے اس کا یقین کامل ہے کہ انشاء اللہ ہم دونوں اپنی موت سے قبل ہوم رول کا سکہ ہندوستان میں چلتے دیکھ لیں گے -

لیکن اگر مشیت ایزدی یہ ہوئی کہ ہم اپنے دل کی حسرت پوری ہونے سے قبل اس جہان فانی سے کوچ کر جائیں تو ہم مسرت و شکریہ کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیں گے - اور اپنے بنانے والے کے سامنے خوشی سے اس خیال کے ساتھ جانے کو تیار ہو جائیں گے کہ شاید ہماری کوششیں جو کہ ہم اپنے مذہب قوم اور ستم زدہ بنی نوع انسان کے لیے کرتے ہیں - ہماری دوسری خامیوں کا کفارہ ہو سکیں اور ارحم الراحمین اپنی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کر دے - ہم مجاہدین فی سبیل اللہ کی حیثیت سے ضرور ہی کر سکتے ہیں کہ حتی المقدور کوشش کریں اور اس کے بعد ہم کو خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے -

ہم کو اس عرصہ میں ایک صدمہ عظیم برداشت کرنا پڑا کہ راجہ غلام حسین ایڈیٹر نیو ایرا کا انتقال ہو گیا - کیونکہ مرحوم پنجاب میں پیدا ہوئے تھے اور ہمارے رشتہ دار بھی تھے -

ہوگا! اسباب وہ صبر اور دعا کی تاثیر پہ پورا بھروسہ رکھتی ہوں گی اور ان کو بہت
ہونا چاہیے کہ اُن کی اور اُن کے شرکار کار کی کوششیں بیکار نہیں ثابت ہو رہی ہیں
وہ اور اُن کے بہادر ساتھی نظربند کر دیے گئے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے کیا ملک
بعید ترین مقامات میں ہزاروں ایسے مردانِ خدا نہیں ہیں جنہوں نے اُن کے کام کو
رکھا ہے۔ اگر ایک ہوم رول کا جھنڈا زبردستی جھکا دیا گیا تو کیا اس کی جگہ ہزاروں
جھنڈے بلند نہ ہوں گے، اپنی حیات کا اندازہ کرتے ہوئے مجھے پورا پورا یقین ہے
ہزاروں اور لاکھوں آدمی اس خوبصورت سُرخ و سبز جھنڈے کو اپنے گھروں پر
گے بلکہ دلوں میں جگہ دیں گے۔

اپنے سارے زمانہ بیوگی میں میں نے کبھی رنگین چیز نہیں پہنی لیکن اب میں
سُرخ و سبز جھنڈے کو خواہ کعبہ کے مقدس نشان کے نیچے اپنے برقعے یا نقاب
نقاب دار پوشش پہ چسپاں کروں یا باہر نکلتے وقت پہنے ہوتی ہوں لگاؤں گی، یہ ایک بیان
کے لیے اپیل کروں گی۔ میرے اس عمل کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی شخص کو اپنے
اظہار کرتے ہوئے شرمانا نہ چاہیے اور اُس کے نتائج سے ڈرنا چاہیے۔ میں آپ
سچ کہتی ہوں مجھے تو بجائے غصہ کے اس بات پر افسوس آتا ہے کہ حکام اپنی
سے یہ خیال کر بیٹھے ہیں کہ اس قسم کے اظہار حکومت سے سلطنت کی جڑ بیخ ہوتی ہے
کاش کہ وہ ان چیزوں کو ہماری آنکھوں سے دیکھ سکتے اور معلوم کرتے کہ پردہ
عورتیں تک اس بات کو خوب سمجھتی ہیں کہ اس قسم کے اظہار ناراضگی کا اثر صرف
ہو سکتا ہے کہ اُن کی حکومت کی بنیاد کو صدمہ پہنچے۔

چند سال ہوئے کہ "بندے ماترم" کا نعرہ جو کہ معصوم اور درحقیقت قابل فخر
نعرہ ہے بنگال میں باغیانہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے بنگالیوں
کو تکلیفیں اور ذلتیں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن اس پر بھی مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ

لے یہ کرکٹ کا کھیل یہ مشاغل تھے۔ اس کے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کے جوان لوگ اس تمام شور و غل اور بے فکری کی زندگی سے کس قدر خوش تھے لیکن ان میں سے ایک پر یعنی غلام حسین پر جو سب سے زیادہ روشن خیال لوگوں میں سے تھے دست اجل دراز ہو چکا تھا۔

مرحوم کس قدر شرمیلے اور حیا پرور عزیزوں میں خاموش اور بے تکلف دوستوں کے ساتھ ہنس مکھ اور پُر مذاق تھے اور یوں تو وہ ہر جگہ ہر دلعزیز تھے۔ میں نے اس مرتبہ اُن میں ایک اچھی نمایاں تبدیلی دیکھی تھی اور ایسی سنجیدگی دیکھی تھی جو کہ مذہبیت سے [illegible] ہے اور بہت امید کے ساتھ میں نے اُن سے اپنے خاموش طریقے سے اوقات نماز وغیرہ کے لیے ازروے پابند رہنے کی ہدایت کی تھی۔ غلام حسین پر نصیحت کبھی ضائع نہیں ہوتی تھی اور میں نے اُن سے زیادہ متحمل شخص کبھی نہیں دیکھا کہ جس نے اپنے برابر والے اور کم عمر دوستوں کی سخت ترین سرزنش اور نصیحت کا برا نہ مانا ہو۔ جب وہ مجھ سے رخصت ہونے آئے تو آخری الفاظ اُن کے یہ تھے کہ میں آئندہ خدا کے اس کام کے ساتھ جو میں کر رہا ہوں اپنی نماز بہت پابندی سے ادا کروں گا۔ اور وہ جوان اور تندرست تھے اور ہماری دانست میں زندگی کے کتنے ہی دن اُن کے لیے بہت سی اچھی چیزیں موجود تھیں اُن کا اس جوانی میں انتقال ہو گیا اور ہم بوڑھے ہیں لیکن موت کا خطرہ ہمارے دل میں بھی نہیں ہے۔

یہ ہم لوگوں کو بتلا سکتا ہے کہ گو کہ ایک اچھے مقصد کے لیے مرنا ایک شاندار اور بہادرانہ بات ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ایک اچھی بات ہے لیکن زیادہ شاندار اور زیادہ بہادرانہ نہیں اور بعض اوقات سخت بات ہے کہ آدمی اچھے مقصد کے لیے زندہ رہے بے انتہا مشکلات اور روزمرہ کی [illegible] اور تکالیف کے اس کے پورا کرنے کی کوشش میں اللہ ہے۔ اس لیے میں جناب باری کی درگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ میری [illegible] مسز بسنتھ کو اور جناب کو جو کہ اس جوانمردی اور بہادری سے کام کر رہی ہیں۔ بہت [illegible]

لیکن ہماری اُن کی دلی محبت تھی اور ہم اُن کو خویش و یگانہ تصور کرتے تھے۔ بیس برس سے زیادہ عرصے تک وہ ہمارے خاندان کے ایک ممبر سمجھے جاتے رہے۔ کیونکہ وہ [illegible] محمد علی کے سچے ساتھی اور مددگار تھے۔ برسوں وہ میرے لڑکے کے ہمراہ کلکتہ اور دہلی میں اپنے گھر کی طرح رہے اور یہ میرے لڑکے اور بہو کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صرف تین ہی سال قبل ازیں انہوں نے اپنے انتظام سے اُن کی شادی کی اور اس خوبصورت اور جوان دلہن کو گھر لانے جو کہ بدقسمتی سے آج بیوہ ہے۔

نظربندی کے اس زمانۂ دراز میں جو سب سے بڑی رنج دہ بات ہم نے برداشت کی وہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں کو گورنمنٹ نے اس پیارے اور بہادر ساتھی کے آخری دیدار کے لیے اور ان کے معاملات کو طے کرنے کے لیے لکھنؤ جانے کی اجازت نہیں دی لیکن ہم اپنے دلوں کو یاد کر کے تسکین دے لیتے ہیں کہ اپنی اچانک اور حسرت ناک موت سے ایک ہی ماہ قبل وہ ہمارے یہاں آ کر رہ چکے تھے۔ اس ملاقات کے لیے وہ دو برس سے تیاری کر رہے تھے، لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی یکایک حائل ہو جاتی تھی کہ وہ یہاں نہ آ سکتے تھے اور یہ ملاقات جو انہوں نے ہم سے کی اس وقت ہوئی جبکہ دست اجل دراز ہو چکا تھا اور اس طرح گویا وہ ہم سے ہمیشہ کے رخصت ہونے آئے تھے۔

وہ عید کے زمانہ میں چار دوستوں کے ہمراہ تین دن کی چھٹیاں گزارنے یہاں آئے تھے اور کیا ہی تعطیل تھی جبکہ ہمارا گھر ہنسی کے غل اور شور سے گونجتا رہتا تھا اور کوئی اجنبی شخص ان مسن ہم مکتبوں کو اس طرح ٹھٹے لگاتے اور مذاق کرتے دیکھتا تو اس کو اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کو کچھ افکار و ترددات بھی ہو سکتے ہیں چونکہ ان دل و دماغ ہر لحظہ متفکر اور متردد رہتے تھے۔ ان تین دنوں میں یہ خفتہ تو گویا ہوتی ہی نہ تھی۔ گرم اور تیز مباحثے، نئے اور پرانے قصے، مذاق اور دل لگی اور تبدیلی حالت

اس کا نام لیتے شرم آتی ہے اور یہ دس روپے کی رقم کم از کم پچیس چھوٹے بڑے آدمیوں کی خوراک میں سے بچا کر نکالی گئی ہے اور اس لیے اپنی محبت کے یادگار کے طور پر ہم اپنی نہایت مظلوم عزیز اور مصیبت زدہ بہن کو بھیجتے ہیں۔

لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ یاتیں ابھی کچھ عرصہ جاری رہیں گی اور ہم کو انہیں برداشت کرنا چاہیے۔

خدا تم سب کا ساتھی ہو۔

تمہاری بہی خواہ

آبادی بانو

تندرستی، خوشی اور اس سے زیادہ کارآمد زندگی کے بہت سے سال عطا کرے۔ براہِ مہربانی میری بہن کو لکھ دیجیے کہ ان کو خوش و خرم رہنا چاہیے تاکہ اُن کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے دلوں کو اُن کی تندرستی کے متعلق تفکرات سے نجات ملے۔

مجھے خدا کی ذات سے امید واثق ہے کہ اب جبکہ اُن کی جائے قیام بدل دی گئی ہے تو باوجود اُن تمام فکروں کے جو اُن کو حال میں پیدا ہو گئی ہیں وہ اچھی اور تندرست ہوں گی مجھے نہایت خوشی ہو گی اگر آپ تینوں کے فوٹو میرے پاس ہوں لیکن میں آپ کو متنبہ کیے دیتی ہوں کہ ایک یا دو سے کام نہیں چلے گا کیونکہ میں اپنے خاندان کے اور بڑے دعویداروں کو آسانی سے ٹال نہ سکوں گی۔ میں چند اپنی سب کی تصاویر بھیجتی ہوں جو لفٹیناؤن مقام میں گزشتہ سے لی گئی تھیں۔ گرچہ وہ اس قابل نہیں ہیں تاہم شاید آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔

آج میں مبلغ دس روپیہ کا منی آرڈر آپ کو بھیجتی ہوں یہ بسنٹ فنڈ کے لیے ہماری طرف سے دوسری قسط ہے۔ مجھے محمد علی کی زبانی یہ سن کر تعجب ہوا کہ گورنمنٹ نے آپ کے نام جو میرا خط گیا تھا اس کی بابت کچھ عجیب سوالات کیے اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ سوال تھا کہ میں یہ رقم دس روپیہ کی بسنٹ فنڈ میں دینے کو ماہوار کیونکر بچا سکتی ہوں۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میرا خط جو آپ کے نام تھا اس کو غور سے نہیں پڑھا گیا۔ ایک عورت جو اپنی چالیس ہزار کی جائداد فروخت کر کے اپنے بچوں کا قرضہ پندرہ ہزار روپیہ سال کے اندازے سے گزشتہ دو سال کے زمانہ نظربندی میں ادا کرتی رہی ہو کیا یہ مقدرت بھی نہیں رکھتی کہ وہ یہ قلیل رقم فروخت کے حاصل میں سے نکال سکے؟ اور کیا دس روپیہ ماہوار اپنی ضروریات زندگی کو کم کر کے ماہوار مصارف میں سے بچا لینا کوئی غیر معمولی بات ہے۔ بالخصوص جبکہ یہ رقم ایک ایسے مقصد کے لیے ہو جو کہ ہمارے دلوں کو اس قدر عزیز ہے۔ بہرحال میرا اعتراض میں قدر قلیل سے کہ مجھے

میں دلی میں ہز ایکسی لینسی وائسرائے ہند سے ملاقات کر کے ابھی واپس آئی ہوں اور اس ملاقات کا نتیجہ بھی وہی نکلا جو ہوم ممبر کی ملاقات کا نکلا تھا۔ ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے میرے تمام پیش کردہ دلائل کو بغور سنا اور بہت صاف باتیں کرتے رہے۔ لیکن وہ اس بات کے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ میری اور محمد علی کی نظربندی کا معاملہ ایک ہی ہے۔ محمد علی کی نظربندی کا تعلق جنگ سے ہے اور میری نظربندی کا تعلق خانگی اصلاحات سے تھا۔ وائسرائے اور ان کی کونسل شوکت علی اور محمد علی صاحبان کی نظربندی کے معاملہ پر غور اور مزید غور کر چکے ہیں اور مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو گورنمنٹ کا معتمد الیہ ہے یہ اطلاع دی ہے کہ گورنمنٹ نے بالاتفاق یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مذکورہ بالا نظربندوں کو رہا نہ کیا جائے۔ میرے خیال میں گورنمنٹ ہند ایمانداری کے ساتھ اس فیصلہ پر پہنچی ہے اور جنگ کی موجودہ صورت اس قدر نازک نہ ہوتی جیسی کہ اب ہے تو گورنمنٹ ہند ان نظربندوں کو بھی خوشی سے رہا کر تی۔

مشرقی رزمگاہ میں روس کی ہزیمت اتحادیوں کی کمزوری کا باعث ہوئی ہے، جس سے جرمنوں کی ہمتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور علیٰ ہذا القیاس ترکوں کی بھی۔ میرے خیال میں گورنمنٹ کو اس بات کا خوف ہے کہ کہیں مسٹر محمد علی کی دلی لیکن بھولی ہمدردی جو انہوں نے ترکوں کے ساتھ اب تک ظاہر کی ہے، آزادی کے بعد سرگرم ہمدردی کی شکل اختیار نہ کرے جس سے حکومت کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہ ہو جائے ممکن ہے کہ میرا یہ خیال غلط ہو لیکن مجھے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

ہم لوگ جن کو ان دونوں بھائیوں کی وفاداری پر کامل اعتماد ہے کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ وہ ہندوستان کو حملہ آوروں سے خواہ وہ ترک ہوں یا غیر مسلم بچائیں گے، اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ جو مجبرل ہمدردی انہیں اپنے مذہبی پیشوا سے ہے وہ ان کی اس عملی ہمدردی پر حاوی نہیں ہو سکتی جو انہیں ملک معظم اور ان کی سلطنت کے اغراض

علی برادران کی نظربندی

مسز اینی بسنٹ کا وائسرائے سے ملاقات کے بعد بیان

چونکہ میں ایک حد تک مسٹر شوکت علی اور مسٹر محمد علی صاحبان کی نظربندی کے لئے ایجی ٹیشن کی ذمہ دار ہوں کیونکہ میں نے اپنی نظربندی کے دوران میں یہ رائے دی تھی کہ ان تحریکوں میں جو ہمارے رہائی کے لیے پیش اور منظور کی جائیں۔ مذکورہ بالا دو صاحبان کا نام بھی شامل کر دیا جائے اس لیے مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں موجودہ صورت حال سے تمام ہندوستان کو آگاہ کروں جب سے میری اور میرے رفقاء کی نظربندی کا حکم منسوخ کیا گیا ہے۔

میں نے اکثر تمام جلسوں میں اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں مسلم لیڈروں کو بھی آزاد کر دینا چاہیے اور اس کے علاوہ میں نے آل انڈیا نیشنل کانگریس مسلم لیگ کے مشترکہ جلسہ میں بھی اسی مضمون کا ایک ریزولیوشن پیش کیا تھا چند دن ہوئے میں موجودہ ہوم ممبر اور ان کے جانشین سے ملاقات کرنے کے لیے شملہ گئی تھی اگرچہ ان سے اس مسئلہ پر ایک گھنٹے تک گفتگو ہوتی رہی اور انہوں نے میرے دلائل کو بھی غور سے سنا تاہم ان کے اس خیال کو دور کرنے سے قاصر رہی کہ موجودہ حالت میں کہ انگلستان جنگ میں برسرپیکار ہے ان دونوں بھائیوں کی رہائی ہندوستان کے امن عامہ میں خلل ڈالنے کے قیام کی ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ہے کہ ایسی درخواست ضرور منظور ہوگی، مگر ہم نہ ایک شکایت کے رفع کرنے کے لیے اس نہایت جائز طریقہ کو استعمال کریں؟ اکثر بڑے بڑے قانون دانوں کی رائے میں قانون تحفظ ہند ایک غیر آئینی حیثیت رکھتا ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو ہمارا مسلمان بھائیوں کی کامیابی سینکڑوں نظربند اشخاص کو آزاد کر دے گی گیا ہمیں اس تجویز پر عمل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ہماری دوسری تمام تجاویز ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

اس بارے میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال خرچ کا ہے میں تجویز پیش کرتی ہوں کہ ہم ہندوستان اور انگلستان میں اس مقدمہ کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے ایک فنڈ قائم کریں، جس میں مسلمان اور ہندو دونوں چندہ دیں میں خوشی کے ساتھ اس سوسائٹی کی خازن کا فرض ادا کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ چندہ دینے والے اصحاب کی یہ خواہش ہو اور کوئی ذمہ دار مسلمان اس فرض میں میرا ہاتھ بٹائے۔ انگلستان میں میرے قانونی مشیر ہمیں وہاں مدد دیں گے اور ہمیں پوری امید رکھنی چاہیے کہ ہمیں کامیابی بھی ہوگی۔

خاتمہ پر میں مسلمانوں سے اس امر کے لیے اصرار کرتی ہوں کہ اس عارضی ناکامی کا اگرچہ یہ افسوسناک ہے، یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری ہمتیں پست ہو جائیں۔ اگر گورنمنٹ ہماری اپنی ہوتی اور وہ بکمال منصفانہ جابدہ ہوتی تو بیشک ہم اُن کے فیصلہ کو صدق دل سے قبول کر لیتے کیونکہ موجودہ حالت میں یہ ناممکن ہے کہ ہم اس فیصلہ کو تسلیم کریں۔ جبکہ سی۔ آئی۔ ڈی کے عہدہ دار گورنمنٹ کے کان بھرتے رہتے ہیں جبکہ یوروپین اصحاب جبر و استبداد کی پالیسی قائم رکھنے کے لیے شور مچاتے ہیں اور جبکہ حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں پر اعتماد اور سچے انگریزی تدبر کے جواب میں اینگلو انڈین اخبارات چیخنا شروع کر دیتے ہیں جن کے لیے پریس ایکٹ کوئی خطرہ نہیں اعتبار اعتبار کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ گورنمنٹ کی نادانی ہے کہ وہ ہم سے پورے اعتماد کی توقع رکھے تاوقتیکہ وہ ہم پر پورا بھروسہ نہ کرے

دمقاصد سے ہے ان دونوں بھائیوں کو اپنے روحانی پیشوا کے ساتھ ویسی ہی ہمدر
ہے جیسے کہ اس رومن کیتھولک کو جو پاپائے روم کے مذہبی اقتدار میں اہل آسٹریا کو
عقیدہ ہو کہ انہیں اپنے ملک پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دے گا موجودہ زمانہ میں
مذہبی اور سیاسی ہمدردیوں کے درمیان اکثر تصادم ہو جاتا ہے لیکن مسلمانان ہند
کی سیاسی وفاداری کبھی اپنی حد سے اس قدر باہر نہیں نکلی کہ وہ اپنے ہم مذہب تر
بھائیوں کے ساتھ عملی ہمدردی کریں۔

اگرچہ ہم باہمی ربط اور ملاقات کی وجہ سے اس بات کو محسوس کر سکتے ہیں لیکن
ہم کبھی یہ امید نہیں کر سکتے کہ گورنمنٹ بھی اس معاملہ میں ہماری ہم خیال ہو انگریز
اتحادیوں کے نصب العین (اور یہی نصب العین ہندوستان کا ہے) کی نگہداشت کا
فرض ہم پر نہیں بلکہ گورنمنٹ پر عائد ہوتا ہے اس لیے حکومت کے معاملات میں ہمارا
کوئی دخل نہیں، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم لوہانیہ کی جمہوری سلطنت نے بھی دوران
جنگ میں فوجی معاملات کے انتظام کے لیے ایک فوجی افسر کو اپنا حاکم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا
اگرچہ جنگ کے ختم ہوتے ہی انہوں نے اس کو اس عہدے سے برطرف کر دیا۔

اب تک تو ہم گورنمنٹ کو اس امر کا یقین دلانے سے قاصر رہے ہیں کہ ان
بھائیوں کی رہائی سے امن عامہ میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم
آئندہ کیا کرنا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ اب ہمیں قانون سے اپیل کرنا چاہیے
درخواست میں نے اپنی طرف سے پریوی کونسل میں پیش کی تھی۔ اس میں دونوں [illegible]
کی نظر بندی کے حسب حال تھوڑی سی ترمیم کرنی چاہیے۔ پہلے ہم مقامی ہائیکورٹ
میں مقدمہ دائر کریں اور اگر مقدمہ خارج ہو جائے تو پھر انگلستان کی جوڈیشل کمیٹی کی
طرف رجوع کریں۔ مذکورہ بالا عرضی کا مسودہ انگلستان کے ان اعلیٰ قانون دانوں
مرتب کیا ہے جو سلطنت کے آئینی قوانین میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں ای کی یہ رائے

مسز اینی بسنٹ کے نام ام الاحرار کا خط

علی برادران کی نظربندی اور حکومت ہند کی روش

"مسز بسنٹ نے اپنی ملاقات وائسرائے کے نتیجہ سے پبلک کو بذریعہ ایک بیان کے مطلع کیا تھا حسبِ ذیل خط علی برادران کی والدہ محترمہ نے اس کے جواب میں شائع کیا جس نے بہت سی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا ہے"۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمْ

پیاری بہن! اگرچہ حال میں آپ کا کوئی مرودت نامہ مجھے موصول نہیں ہوا، لیکن ایک ماہ کا عرصہ ہوا جبکہ آپ نے ہز ارگسی لینسی حضور وائسرائے سے میرے لڑکوں کی آزادی کے متعلق گفتگو کی تھی اور وہاں سے واپس ہو کر آپ نے اپنی کوششوں کے متعلق پبلک کی آگاہی کے لیے اخبارات میں ایک مراسلت شائع کی تھی اس لیے اس تحریر کا جواب میں اپنے اوپر فرض سمجھتی ہوں۔ میں اس سے بہت پہلے آپ کو خط لکھتی لیکن میری طبیعت ناساز ہوگئی تھی اور اس کے بعد محمد علی، شوکت علی بیمار ہو گئے، اس کے علاوہ ہمارے منیر قانونی مشر گھاٹے جو ازراہِ شفقت ہماری خط و کتابت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ایک مقامی سیاسی تحریک کی وجہ سے موجود نہ تھے اس وجہ سے میں جلد خط و کتابت کرنے سے قاصر رہی۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ اس دوران میں وہ اس مسرت انگیز دن کو جو قریب آ رہا ہے اپنی کوشش کی باگ کو ڈھیلا چھوڑ دینے سے ٹال دیں۔ اور وہ کوشش یہ ہے کہ ہندوستانی معاملات کو مسٹر چیمبرلین کے سامنے پیش کر کے جلد سلف گورنمنٹ حاصل کریں۔ جو رنج انہیں قدرتی طور پر اٹھانا پڑا ہے اس کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہوم رول کے لیے کام کرنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ ہوم رول ہی ایک ایسی چیز ہے جو رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان اعتماد اور بھروسہ کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔ جس قدر زیادہ مسلمانوں کو اس بات کا خیال ہوگا کہ ان کے بھائیوں کو رہا ہونا چاہیے جو ایسی نظربندیوں کو آئندہ کے لیے ناممکن الوقوع بنا دے اور ہمیں اس امر کا موقع دے کہ صلح ہو جانے کے بعد ہم اس گورنمنٹ کو برطرف کر سکیں جس نے ان اختیارات کا ناجائز استعمال کیا تھا جو اسے دوران جنگ میں ضروریات کے خیال سے دیے گئے تھے۔

مسز اینی بیسنٹ

آپ مجھے معاف کریں گی اگر میں آپ کے خیالات سے کلیتہً اتفاق نہ کروں خاص کر جب
آپ اس امر کو ملحوظ رکھیں گی کہ بحیثیت ایک ایسے انسان کے جو نظر بندوں کے ساتھ رہا ہو
اور جس کو ان کے نقطۂ نگاہ سے دریافت حقیقت کا موقع ملا ہو، میں آپ کی ہم آہنگی پر تیار
نہیں ہوں۔ میں آپ کے ساتھ اس خیال میں یقیناً شریک ہوتی کہ اگر موجودہ نازک منزل پر نہ
پہنچی ہوتی تو حضور وائسرائے اور ان کی ممبران کونسل بہ طیب خاطر میرے لڑکوں کو رہا کر دیتے۔
لیکن کچھ وجوہ ایسے ہیں (ان وجوہ کو مسٹر گاندھی اپنے ایک علیحدہ خط میں ظاہر کرنے والے ہیں)
جن کے باعث میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتی ہوں۔

گورنمنٹ کی اس غیر منصفانہ روش کو موجودہ طرز عمل سے ہم آہنگ بنانا سخت
دشوار ہے کہ اس نے میرے لڑکوں کو وزیر ہند اور ان کے ہمراہیوں اور خود حضور وائسرائے
سے آئینی اصلاحات پر گفتگو کے لیے ملاقات کی اجازت نہیں دی اور اس امر پر اصرار کیا
کہ کانگریس اور لیگ کی طرف سے جو وفد حضور وزیر ہند کی خدمت میں پیش ہوا اس میں
محمد علی شریک نہ کیے جائیں۔ آپ تحریر فرماتی ہیں "مسٹر محمد علی نے ٹرکی کے ساتھ جو سخت
لیکن مجہول ہمدردی ظاہر کی ہے میرے خیال میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر سے اس میں یہ
خطرہ پایا جاتا ہے کہ کہیں یہ مجہول ہمدردی عملی ہمدردی کا جامہ نہ پہن لے۔"

حضور وائسرائے سے آپ کی ملاقات سے پہلے یہ امر صاف طور سے معلوم نہیں
ہوا تھا کہ ملک معظم کے کس دشمن کے ساتھ میرے لڑکوں نے آزادانہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔
لیکن چونکہ اب یہ امر واضح ہو گیا کہ میرے لڑکوں نے آسٹریوں، جرمنوں اور بلغاریوں سے
ہمدردی نہیں ظاہر کی تھی بلکہ جن کی ہمدردی کا میرے لڑکوں پر الزام ہے وہ ترک ہیں میں
یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آیا گورنمنٹ کو درحقیقت مسلمانوں کی حالت کا بخوبی احساس بھی
ہے یا نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی صحیح حالت کے سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہو
گئی ہے۔ میرے لڑکوں کو ترکی سے اس سے زیادہ ہمدردی نہیں ہے جتنی کہ ان کو میں

اس معذرت کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی کہ کہیں میری خاموشی کا غلط
معنی نہ بتائے جائیں جس طرح حضور وائسرائے کی ملاقات کے بعد آپ نے جو پبلک کو
نصیحت کی ہے۔ بعض باتوں میں اس کے متعلق افسوسناک غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ میں کسی
طور پر نہیں بلکہ حقیقتاً آپ کی شکر گزار ہوں اور ان زحمتوں کو امتنان و پسندیدگی کی نگاہ
سے دیکھتی ہوں جو آپ نے میرے بچوں کی رہائی کے لیے کی ہیں اس عمر و تندرستی کی
حالت میں آپ نے دور دراز سفر اختیار کیے۔ افسوس کہ آپ کی جد و جہد زیادہ بار آور
نہ ہوئی لیکن اس ناکامیابی کا اثر اس بات پر نہیں پڑتا ہے جو ہماری گردن پر
ہے اور اس سے ہمارے اس استقامت میں کچھ فرق پیدا ہوتا ہے کہ انشاء اللہ آخر
کار ہم فتح حاصل کریں گے۔ جہاں تک میرا اور میرے بچوں کا تعلق ہے ہم نے اپنی حالت
کو مشیت ایزدی کے سپرد کر دیا ہے اور رضیٔ الٰہی سے لو لگائے ہوئے ہیں:۔

ما کار خویش را بخداوند کارساز
بگذاشتیم تا کرم او چہا کند

اس لیے ہم کو وثوق ہے کہ کوئی ناامیدی یا مایوسی ہم کو متاثر نہیں کر سکتی کیونکہ
یہ اثر بے دینی اور بے توکلی سے پیدا ہوتا ہے چونکہ ہم توفیق الٰہی پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں
اس لیے ہم کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ ہمارے احباب ہم کو کیا مدد پہنچا رہے ہیں اور نہ
اس سے بھی متاثر نہیں ہوتے کہ ہمارے مہربانوں کی کوششیں جلد یا دیر میں بار آور ہوتی
ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم ان کی کوششوں کے لیے ممنون احسان نہیں
ہیں یا ہم کو ان تدابیر کے موثر ثابت ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں جو ہمارے ہمدرد لوگ وطن
کی آزادی کے لیے تجویز کرتے ہیں۔

ظاہراً مجھے آپ کی طرح سے اس بات پر حکام بالادست کے خیالات کا
کرنے کا موقع نہیں ملا ہے کہ میرے لڑکوں کی رہائی میں وہ کس چیز کو سدّ راہ سمجھتے ہیں

حکومتی کے علاوہ سلطان ٹرکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسرے دنیاوی مسلم تاجداروں کو حاصل نہیں ہے وہ امتیاز کیا ہے تاج خلافت کا زیب سر کرنا ہے آپ خلیفۃ الرسول اور امیر المومنین ہیں۔ میں بے حد مسرور ہوں کہ ہماری حکومت نے کم سے کم اس بات کو محسوس کر لیا ہے کہ مسئلہ خلافت کا تصفیہ غیر مسلمین کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے لیکن اس احساس و اعتراف سے کیا فائدہ ہے جبکہ ہندوستان کے بہترین مسلمان محض اس جرم میں اپنی آزادی سے محروم ہو رہے ہیں کہ وہ آزادی سے عالم اسلامیہ کے روحانی فرد اور اس کی مسلم رعایا سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں حالانکہ اس بات کا اقرار کیا جاتا ہے کہ ان کی ہمدردی مجہول تھی۔

میں اس بات پر ایک مرتبہ اور زور دینا چاہتی ہوں کہ سلطان ٹرکی سے ہمدردی کرنا اور اس کے حکمران کو روحانی پیشوا تسلیم کرنا کوئی سیاسی کھیل تماشا نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اُن کو مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے یہ عقیدہ بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے دینی اصول ہیں جن کو مذہب اسلام کی روح سمجھنا چاہیے۔ اس کے حدود اُسی سختی کے ساتھ قائم کیے گئے ہیں جس طرح دوسرے مذہبی حدود۔ میں کوئی عالم دین نہیں ہوں اور نہ میرے لڑکے عالم دین ہیں۔ اور اس مسئلہ میں دوسرے مسئلوں کی طرح ماہران دین کی رہنمائی کے خواہاں ہیں لیکن اس قدر تو تمام مسلمانوں کو ہماری طرح معلوم ہوگا کہ اپنے برادران ملت کے ساتھ ہمدردی کا جو حکم دیا گیا ہے اس ہمدردی کے حدود کو کل حالتوں میں یکساں اور غیر متغیر رہنا چاہیے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرے لڑکوں نے اس اصول کو ٹرکی کے خلاف برطانیہ کے اعلان جنگ کے بعد قائم کیا ہے یا یہ اصول ہمدردی ایک مکمل صورت میں ۱۳ سو برس ہوئے ہم کو تعلیم ہوا تھا بجائے اس کے کہ گورنمنٹ ناواقف اور ناقابل اعتماد آدمیوں کی رپورٹوں پر بھروسہ کرے وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے یہی وہ

سے ہے لیکن ہم میں سے ہر شخص کو جو قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہے یہ تاکیدی حکم دیا گیا
کہ وہ کل مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے اور ان کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کرے
اس وقت تک کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہے جب تک وہ مسلمانان ٹرکی کے
ساتھ اسی آزادانہ ہمدردی کے تبلیغ و اظہار میں کوشاں نہ ہو جس آزادی کے ساتھ
مسلمانانِ ایران ہندوستان و عربستان سے ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔

گزشتہ چھ سات برس کا زمانہ عالم اسلامیہ کے لیے ایک اندوہناک دور رہا ہے
اور میں اس امر پر فخر کرتی ہوں کہ اس زمانہ میں جہاں کہیں اور جب کبھی مسلمانوں کو مصائب
کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے لڑکوں نے ان کے درد کو محسوس کیا اور خود بھی ان کے ساتھ شریک
ہوئے۔ ایران، مراکش اور طرابلس کے مسلمان ٹرکی کے مسلمانوں سے ہمدردی کے کم مستحق
تھے اور ان سب کے ساتھ برابر ہمدردی ظاہر کی گئی کیونکہ سب برابر کے مسلمان تھے
کلام مجید کی تعلیم کے مطابق سب مستحق ہمدردی تھے اس کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ طرابلس
اور بلقان کی ہنگامہ آرائیوں میں مظلومین کے ساتھ جو ہمدردی ظاہر کی گئی اس کو سابق
اور حکام بالادست نے ناپسند نہیں کیا بلکہ اس کے لیے ہماری حوصلہ افزائی کی گئی
ترکوں نے بھی اس ہمدردی کو آزادی کے ساتھ ظاہر کیا۔ ان کی یہ ہمدردی کسی سیاسی
پسندیدگی کی بنا پر نہ تھی بلکہ وہ ان کے مذہب کا ایک جزو تھی اور اس وقت سے اب تک
کوئی ایسی بات نہیں پیدا ہوئی جس سے اس مذہبی فرض کا ادا کرنا جرم قرار دیا جائے

اسی کے ساتھ ایک امر خاص کی اور بھی وضاحت ضروری ہے کہ دنیا کے جس حصہ
میں مسلمان ہوں ان کے ساتھ ان کے برادران ملت کی ہمدردی ضروری ہے۔ بلکہ
سلطان ٹرکی کی ایک خاص حالت ہے۔ بہ حیثیت ایک دنیاوی حکومت کے وہ عالی
ایک تو بہ حیثیت ٹرکی کے نام سے موسوم ہے سلطان اسی طور سے حکمران ہیں جس طریقہ سے
شاہ کجکلاہ سرزمین فارس پر یا امیر افغانستان پر حکومت کرتے ہیں۔ لیکن اس دنیاوی

حکومتِ ٹرکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسرے دنیاوی مسلم حکرانی کے علاوہ سلطان ٹرکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسرے دنیاوی مسلم
تاجداروں کو حاصل نہیں ہے وہ امتیاز کیا ہے تاج خلافت کا زیب سر کرنا ہے آپ خلیفۃ
الرسول اور امیر المومنین ہیں۔ میں بے حد مسرور ہوں کہ ہماری حکومت نے کم سے کم اس بات
کو محسوس کر لیا ہے کہ مسئلہ خلافت کا تصفیہ غیر مسلمین کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے لیکن
اس احساس و اعتراف سے کیا فائدہ ہے جبکہ ہندوستان کے بہترین مسلمان صرف اس
جرم میں اپنی آزادی سے محروم ہو رہے ہیں کہ وہ آزادی سے عالم اسلامیہ کے روحانی فرمانروا
اور اس کی مسلم رعایا سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں حالانکہ اس بات کا اقرار کیا جاتا ہے کہ
ان کی ہمدردی مجہول تھی۔

میں اس بات پر ایک مرتبہ اور زور دینا چاہتی ہوں کہ سلطان ٹرکی سے ہمدردی
کرنا اور اس کے حکمران کو روحانی پیشوا تسلیم کرنا کوئی سیاسی کھیل تماشا نہیں ہے کہ جس کا جی
چاہے اُن کو مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے یہ عقیدہ بازیچہ اطفال نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے
دینی اصول ہیں جن کو مذہب اسلام کی روح سمجھنا چاہیے۔ اس کے حدود اسی سختی کے
ساتھ قائم کیے گئے ہیں جس طرح دوسرے مذہبی حدود۔ میں کوئی عالم دین نہیں ہوں اور
میرے لڑکے عالم دین ہیں۔ اور اس مسئلہ میں دوسرے مسئلوں کی طرح ماہرانِ دین کی رہنمائی
کے خواہاں ہیں لیکن اس قدر تو تمام مسلمانوں کو ہماری طرح معلوم ہوگا کہ اپنے برادرانِ ملت
کے ساتھ ہمدردی کا جو حکم دیا گیا ہے اس ہمدردی کے حدود کو کل حالتوں میں یکساں اور
غیر متغیر رہنا چاہیے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرے لڑکوں نے اس اصول کو ٹرکی کے خلاف
برطانیہ کے اعلان جنگ کے بعد قائم کیا ہے یا یہ اصول ہمدردی ایک مکمل صورت میں
۱۳ سو برس ہوئے ہم کو تعلیم ہوا تھا بجائے اس کے کہ گورنمنٹ ناواقف اور ناقابل
اعتماد آدمیوں کی رپورٹوں پر بھروسہ کرے وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے یہی وہ

سے ہے لیکن ہم میں سے ہر شخص کو جو قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہے یہ تاکیدی حکم
کہ وہ کل مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے اور ان کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کر
اس وقت تک کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہے جب تک وہ مسلمانوں
ساتھ اسی آزادانہ ہمدردی کے تبلیغ و اظہار میں کوشاں نہ ہو جس آزادی کے سا
مسلمانانِ ایران ہندوستان و عربستان سے ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔

گزشتہ چھ سات برس کا زمانہ عالم اسلامیہ کے لیے ایک اندوہناک دو
اور میں اس امر پر فخر کرتی ہوں کہ اس زمانہ میں جہاں کہیں اور جب کبھی مسلمانوں کو
کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے لڑکوں نے ان کے درد کو محسوس کیا اور خود بھی ان کے ساتھ
ہوئے۔ ایران، مراکش اور طرابلس کے مسلمان ٹرکی کے مسلمانوں سے ہمدردی کے
تھے اور ان سب کے ساتھ برابر ہمدردی ظاہر کی گئی کیونکہ سب برابر کے مسلمان
کلام مجید کی تعلیم کے مطابق سب مستحق ہمدردی تھے اس کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ
اور بلقان کی ہنگامہ آرائیوں میں مظلومین کے ساتھ جو ہمدردی ظاہر کی گئی اس کو سا
اور حکام بالادست نے ناپسند نہیں کیا بلکہ اس کے لیے ہماری حوصلہ افزائی کی
لڑکوں نے بھی اس ہمدردی کو آزادی کے ساتھ ظاہر کیا۔ ان کی یہ ہمدردی کسی
پسندیدگی کی بنا پر نہ تھی بلکہ وہ ان کے مذہب کا ایک جزو تھی اور اس وقت سے
کوئی ایسی بات نہیں پیدا ہوئی جس سے اس مذہبی فرض کا ادا کرنا جرم قرار دیا

اسی کے ساتھ ایک امر خاص کی اور بھی وضاحت ضروری ہے کہ دنیا
میں مسلمان ہوں ان کے ساتھ ان کے برادران ملت کی ہمدردی موجودی ہے۔ لیکن
سلطان ٹرکی کی ایک خاص حالت ہے۔ بہ حیثیت ایک دنیاوی حکومت کے وہ
ایک خودمختار جو ٹرکی کے نام سے موسوم ہے سلطان اسی طور سے حکمران ہیں جس طرح
شاہ کجکلاہ سرزمین فارس پر یا امیر افغانستان پر حکومت کرتے ہیں۔ لیکن اس دنیا

خدا کی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے خواہ بادشاہ کی ہو، ملک کی ہو،
باپ اور دوسرے اعزا کی ہو میرا یہ خیال ہے کہ اگر کسی مسلمان نے گورنمنٹ کے سامنے
اقرار کیا کہ وہ خدا کی اطاعت سے پہلے سلطنت کی اطاعت کرنے گا تو گورنمنٹ
کی وفاداری پر اعتماد کرنا نا پائدار ناؤ پر تکیہ لگانا ہے میں اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ دنیا
حکومتوں کی ضرورتیں اکثر اوقات اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ خدا کی اطاعت
وفاداری سے مقدم رہے ہیں۔ ہر مذہب کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے
لیکن چونکہ بسا اوقات سلطنت کو اس قسم کی دشواریاں پیش آتی رہتی ہیں اس
دنیاوی گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مذہبی اعتقادات سے پوری
حاصل کرے اور ان اعتقادات کی واقفیت کی روشنی میں اپنا راستہ بنائے
حتی الامکان ہر اس پہلو سے اجتناب کرے جس میں اس کی رعایا کی روحانی
ان کو سلطنت کی وفاکیشی سے علیحدہ کرتی ہو۔

ہر حکومت کو چاہیے کہ وہ اس کشمکش کی اہمیت کا احساس کرے جو
رعایا کے درمیان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ان کو یہ طے کرنا ہوتا ہے
سے خدا کی اطاعت کریں یا کسی ایک انسان کی یا بہت سے ممتاز انسانوں کی
کریں دوسرے چاہے جو کچھ طے کریں لیکن مسلمان صرف ایک ہی راستہ اختیار کر
بادشاہ اور ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہیے۔ لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں
کسی سے اس کی روح طلب کرے۔

یہ نہیں کیا جا سکتا کہ میرے لڑکوں نے کبھی اپنے مذہبی عقائد کو پوشیدہ
اور فریب کیا جا سکتا ہے . . . . . . وہ مسلمانان ہند سے اختلاف رکھتے ہوئے
یہ کہہ رہے ہیں کہ جو مسٹر محمد علی، شوکت علی کا عقیدہ ہے، وہی ہمارا بھی عقیدہ
ہے اس لیے ہم سب بھی ان کی طرح نظر بندی کے سزاوار ہیں اپنی نظر بندی کے

نے بار بار گورنمنٹ کو اپنے عقائد سے مطلع کیا ہے اور اس لیے ان پر یہ الزام نہیں عائد کیا جا سکتا کہ انہوں نے ناگہانی طور پر گورنمنٹ کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

میری پیاری بہن! یہ تدبر کی بہت بڑی غلطی ہے کہ پہلے تو باشندگان ملک کے مقدس عقائد کو نظر انداز کیا جائے۔ اس کے بعد ان اعتقادات کے لیے ان کو سزا دی جائے جو مسلمانوں کا نظریہ کرنا وہ چاہے ان کے مذہبی اور سیاسی محبوب لیڈر ہی کیوں نہ ہوں بہت ہی بے اثر سزا ہے۔ اگر سزا کا منشا یہ ہے کہ ملین مسلمان اپنے مذہبی فرض کے راستہ سے روگردان ہو جائیں کیا مسلمانوں کا ہر فرد اپنے مقدس پیغمبر کے اس عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتا ہے کہ ــــ "میری عبادت و ریاضت حیات و ممات اللہ کے لیے ہے جو رب العلمین ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے میں اس کی طرف سے مامور ہوا ہوں اور میں اس کے عبادت گزار بندوں میں سب سے ممتاز ہوں۔" کیا اس اعتقاد کے لیے نظر بندی، قید یا موت کسی مسلمان کو جو سچا مسلمان ہے کچھ خوف زدہ بنا سکتی ہے۔

میں بہت کچھ لکھ چکی۔ مگر آپ کی تجویز کے متعلق کہ میرے لڑکوں کا مقدمہ ہائیکورٹ میں پیش کیا جائے۔ اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر میں یہ ختم نہیں کروں گی۔ افسوس کہ میں قانون سے واقف نہیں، نہ مجھے اس کا کچھ تجربہ ہے جو میری رہنمائی کر سکتا مگر لڑکوں کو کچھ اس کا تجربہ ہے اور ان کے دوست اور مشیر گھاٹے ایسے لوگ ہیں جو اس سے بخوبی واقف ہیں اور ان کو اس کا بھی کچھ تجربہ ہے کہ قانون کس طریقوں پر کام کرتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ میرے بیٹوں کے مقدمہ کے موافق پہلو پر عدالت میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ہائیکورٹ میں بحث محض قانون تحفظ ہند کے جائز و ناجائز برتنے کی کارروائی تک محدود نہ ہو گی اور اس قانون کو واپس لینے کی کونسل پاس کر چکی ہے۔ میں اس کو بخوشی منظور کر لیتی کہ میرے بیٹوں کا مقدمہ غیر طرفدار ججوں کی معمولی عدالت میں پیش ہو۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ محمد علی کی شکستہ تندرستی پر اس کا

اثر بہت خوفناک ہو گا مگر قانون سے صرف روپے والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اسی طرح
میں جبکہ مخالف کے حرزہ کا سرکاری خزانہ تھی ہر وہ ہم میں سے بڑے سے بڑے آدمی کو تباہ کر
سکتا ہے۔

آپ نے اپنی عادت کے موافق اپنی بیدار مغزی اور فیاضی سے قانونی اخراجات
کے لیے ایک فنڈ کھولا ہے اور خود بھی اس میں چندہ دیا ہے مگر میں آپ سے غور کر
تامل کے پوچھتی ہوں کہ کیا اس کا کچھ فائدہ ہو سکتا ہے؟ اگر ہم نے اپنے حاکموں کے خلاف
کوئی فیصلہ کرا بھی لیا تو کیا وہ اس معاملہ کو وہیں چھوڑ دیں گے اگر ہم آپ کی طرح یہ
یقین بھی کر لیں کہ اگر جنگ کی حالت اس قدر نازک نہ ہوتی جتنی کہ آج کل ہے تو وائسرائے
اور ان کی کونسل میرے بیٹوں کو بخوشی رہا کر دیتی تو کیا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جنگ کی بابت
اپنے خیالات اور اس کے نتیجوں پر میرے بیٹوں کی رہائی کو صرف اس وجہ سے خوشی سے
سکیں گے کہ ایک ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خود انہیں میرے بیٹوں کو آزادی
سے محروم کر دینے کا اختیار نہیں ہے؟ اور کیا وہ ایسے بڑے اختیار کو اپنے ہاتھ
سے ایسی آسانی کے ساتھ نکل جانے دیں گے اور ہزاروں ہندوستانیوں کو جو اب تک
میں بڑے سڑ رہے ہیں آزاد ہوتے دیکھ سکیں گے؟ کیا اس وقت برطانوی پارلیمنٹ
قانون تحفظ ہند کو جائز قرار دینے کا یا اسی قسم کا کوئی قانون بنا دینے کا منتظر نہیں
ہو جائے گا؟

بہرحال ان سب باتوں پر غور کر کے فیصلہ کرنے کا انحصار آپ لوگوں پر ہے
تمام معاملات سے بخوبی واقف ہیں مگر میرے خیال میں ان باتوں سے بڑھ کر
ضروری ایک اور مقصد کے لیے چندہ کرنا ہے اور وہ نظر بندوں اور ان کے متعلقین
کی امداد ہے جو اس نفرت انگیز قانون کے ہاتھوں خوفناک تکلیفیں جھیل رہے ہیں
روزانہ مصیبت زدوں کے دردناک قصے سننے میں آتے ہیں جن کو سن کر کلیجہ منہ کو

اور جن کو گورنمنٹ نے آزادی سے محروم کر دیا ہے، ان کو اس بات کا بھی یقین اور اختیار نہیں کہ اپنی روزی کما سکیں اور اپنے بال بچوں کی کفالت کر سکیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت نے ان لوگوں کی بسر اوقات کے لیے کوئی معقول امداد یا کم از کم ضروریات زندگی کے لیے مناسب امداد کرنے کے خیال کو فراموش کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسی حالتوں میں خودکشی کی خبریں بھی سنی گئی ہیں۔ میں پھر وہی کہتی ہوں جو میں نے اپنے عزیز بھائی سر سبرامنی آئر کو لکھا تھا کہ کیا کوئی صورت ان بدنصیبوں کے لیے روپیہ کا سرانجام کرنے کی ہو سکتی ہے اور ان سے زیادہ بدنصیب ان کے متعلقین کے لیے جن کی معصومیت میں قطعی کلام نہیں، روپیہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ گزشتہ ڈھائی برس میں قطعی ناکافی امدادی رقم میں گزر اوقات کرنے کا جو تجربہ مجھے ہوا ہے اس سے میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ ان لوگوں کو ضروریات زندگی حاصل کرنے میں کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا جو ہم سے بھی زیادہ بدقسمت ہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس کچھ جائداد تو ہے جو سخت ضرورت کی حالت میں فروخت ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ بہت سے احباب و عزیز ہیں جو ہماری تکلیف کی خبر سنتے ہی اُس کو رفع کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔

علاوہ مالی امداد کے یہ خیال کہ کچھ بھی بڑی ہمت شکن ہے کہ خیر اگر صرف ہم وطن یا شہر بند ہیں تو ہمارے ہم وطنوں کو تو ہماری حالت کا احساس ہے جو آزاد ہیں اور آرام کے ساتھ بلکہ عیش کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ صرف ان بیبیوں مسلمانوں کا جن میں زیادہ تر مذہبی رہنما یا مقدس کتابوں کے پڑھنے والے ہیں جن کے متعلقین کی مصیبتوں کا حال اردو اخباروں میں چھپتا رہتا ہے۔ بلکہ سینکڑوں بنگالی نوجوانوں کا خیال کر کے میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے، جو جگہ جگہ نظربند ہیں اور جن میں سے بعض تنہا کوٹھڑیوں میں قید ہیں ... رکھنے کا مستقل

ارادہ کرلیا ہے۔

کیا یہ ہماری حب الوطنی پر ایک بدنما دھبہ نہیں ہے کہ قریب قریب تین سال تک ایک نفرت انگیز قانون پر سختی کے ساتھ عمل درآمد ہونے کے باوجود ہمارے پاس کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ایک تفصیلی یادداشت رہے کہ کون شخص نظربند ہیں اور کس کس جگہ نظربند ہیں، وہ کس وجہ سے نظربند ہوئے ہیں اور بعد میں بغیر کسی سبب کے ظاہر کیے ہوئے اکثر پر اور زیادہ سختیاں کیوں عائد کی گئیں ان کے لیے اور اُن کے متعلقین کے لیے جن کی پرورش ان پر لازمی ہے۔ کس قدر وظیفہ مقرر ہے اور نظربندی سے پہلے جس طریقہ پر وہ لوگ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے، اس کو خیال کر کے اپنی گزراوقات کے لیے ان کو اور علاوہ مقررہ امداد کے کس قدر دیگر ذرائع حاصل کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کو جہاں تک ہمارا خیال ہے گورنمنٹ امداد مقرر کرنے کے وقت عادتاً فراموش کر دیتی ہے۔

اس قسم کی یادداشت رکھنا نظربندوں اور ان کے متعلقین کی کفالت کا خیال ان کے بچوں کی مناسب تعلیم گورنمنٹ کے پاس ان کی نمائندگی کے لیے قانونی امداد کا بندوبست نظربندی اور اپنے مقام سے علیحدگی کی وجہ سے اور غیر معمولی رنج و غم میں کسی قدر کمی کرنے کے لیے آمد و رفت کا سلسلہ قائم رکھنا مقامی ارکان کی ناجائز دست و برد سے بچانے کے لیے جو بعض اوقات اس حکومت سے بھی زیادہ ان لوگوں کے خلاف ہوتے ہیں جس کے حکم سے یہ لوگ نظربند ہوتے ہیں اور متواتر سرکاری عمال کے بیانات مقامی لوگوں پر خفیہ طور پر حکام کی سختی کے باعث نظربندوں کی سختیوں میں اضافہ کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ اہتمام ہونا اشد ضروری ہے۔

میرا خیال ہے اس قسم کا اہتمام کرنے میں اور اس کو قائم رکھنے میں کوئی ایسی دقت نہیں ہے جو قابو میں نہ آ سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی تدابیر پر بھی عمل کیا جائے

ذریعے سے نظربندوں کی رہائی ممکن ہو سکے خواہ قانونی عدالتوں میں اپیل کرکے یا بذات خود سرکاری حکام کے ذریعہ سے یا برطانوی قوم اور پارلیمنٹ سے درخواست کرکے یا خود اپنی ہی قوم کو راغب کیا جائے کہ لاکھوں آدمی نظربند ہو جائیں۔ میں کہہ چکی ہوں بہتیرے تو ایسے خوش قسمت ہیں کہ جس امداد کی ضرورت ہوتی ہے ان کو مل جاتی ہے۔ مگر دوسرے لوگوں کی یہ حالت نہیں ہے اور ہمیں خاص طور پر ان کی امداد کے لیے کوئی عملی صورت اختیار کرنی چاہیے۔

ان بیچاروں کو کبھی شہرت نصیب نہیں ہوتی، اور جبکہ ہم تھوڑے سے مشہور لوگوں کے لیے مجاہدہ کر رہے ہیں جو اپنی عام سرگرمی کے باعث مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں ممکن ہے کہ یہ لوگ جن کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے ہمارے دلوں سے محو ہو جائیں حالانکہ غالباً ان لوگوں کی تکالیف نسبتاً زیادہ ہیں اور جن کے وہ مشہور و معروف نظربندوں سے زیادہ مستحق نہیں ہیں۔

ایک بات کا اور میں ذکر کرنا چاہتی ہوں، اور وہ گزشتہ بقرعید پر قربانی کے فساد میں جو ضلع شاہ آباد، گیا اور پٹنہ میں برپا ہوئے۔ ان واقعات نے قدرتاً ہندوستان کے مسلمانوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور یہ اس قدر گہرا اثر ہے کہ جس کا صحیح احساس اندازہ عام طور پر نہیں کیا جاتا ہے۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ ان مسلمان مردوں اور عورتوں کی خوفناک مصیبتوں اور مذہبی توہین پر آپ کو بھی اسی قدر افسوس ہوا ہے جس قدر کہ مجھے میرے دل پر ان واقعات کا بڑا اثر ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔

مگر مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ ان حادثات نے بغیر کسی غلط فہمی کے صاف ظاہر کر دیا کہ ہمیں ابھی کس قدر مذہبی تعصب کی بیخ کنی کرنی باقی ہے جو اتنی مدت سے ہماری ترقی کا سد راہ ہو رہا ہے اور جس سے ہمارے دشمنوں کو خود ہمارے گھر میں بالکلیہ اختیارات نہ دینے کا ایک بہانہ مل رہا ہے۔ جو کچھ ہم کر چکے ہیں ہمیں اس پر

کرنے پر مجبور کیا جن کا تعلق مردوں سے تھا اور بہنوں نے ان غیر معمولی خدمتوں کو کس عمدگی سے انجام دیا اگرچہ نہ صرف ان کے لیے قابل تعریف بلکہ ان کی اولاد کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے تبصرہ کے سادہ بیان میں کونسی ایسی بات تھی جو شہرت گھٹانے جیسے یونیورسٹی کے قابل گریجویٹ اور تجربہ کار وکیل کی قابلیت سے باہر تھی سخت ہوشیاری کے ساتھ میں نے ان سے وہ تمام باتیں کہیں جو میں کہنا چاہتی تھی اور پھر آخر میں اس بات کا اطمینان بھی کر لیا تھا جو میں چاہتی تھی لیا گیا غالباً اس بات کو نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ جب قسمت سے ان معصوم بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تو یہی غریب پردہ نشین ماں تو تھی جو ان کی تعلیم کی منتظم نگہبان تھی اور آج بھی تمام گھر کی مالکہ ہے اور تمام اہم معاملات میں کم از کم اُس سے مشورہ کیے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتے۔

اچھا، اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ ان پر صرف اسی لیے اور زیادہ سختیاں ہوں کہ ان کی ماں جو ان کے ساتھ جبری جلاوطنی میں رہ کر خود بخود اپنے آپ کو چھندواڑہ سے باہر قید دنیا سے قطعی علحدہ نہ کر سکی تو اس میں نہ اُن کا کچھ بس ہے اور نہ میرا۔ اگر میرے خیال کے ان کو کو تسکین ضرور ہو گی کہ جس طرح پہلے بغیر کسی قانونی کارروائی کے یا کوئی وجہ ظاہر کیے ہوئے ان پر نئی قیود عائد کر دی گئی تھیں اور ان کی تمام احتیاط و ہوشیاری ان کو نہ بچا سکی اسی طرح اپنی غریب ضعیف ماں کی بدولت اس مرتبہ پھر اسی قسم کے حکم کے تختۂ مشق بنائے گئے ہیں اور ان کو معلوم ہو جائے گا کہ کس گناہ کی پاداش میں ان کو سزا مل رہی ہے، آیا جب وہ اپنے مذہبی عقیدہ کے باعث مصیبت جھیل رہے ہوں۔ جیسا کہ سرکار کی باتوں سے بجا صاف طور پر معلوم ہوتا ہے یا اپنے ملک کی بدولت جس کی خدمت گزاری میں انھوں نے ان لوگوں کی ناراضگی اور کینہ کے باعث مصیبت اٹھائی کہ اختیارات جن کو میسر ہو گئے ان اور جن کے ہاتھوں میں اس بات کا فیصلہ ہے کہ ان کو آزاد کیا جائے یا نہیں

میں دعا کرتی ہوں اور آپ سے دعا کرنے کی درخواست کرتی ہوں کہ خدایا!
آخر تک اُن کو برداشت کی قوت دے۔ خواہ اس قید ستم کی انتہا قریب ہو یا دُور،
میرا کامل یقین ہے کہ فتح حق انصاف اور صداقت کی ہوتی ہے۔ ہم استقلال کے ساتھ
اس کا انتظار کر رہے ہیں اور جب تک وہ حاصل نہیں ہوتی ہے۔ امداد کی جستجو کرتے ہیں۔
جیسی کہ مسلمانوں کو صبر و شکر کے ساتھ جستجو کرنے کی ہدایت ہے۔

بہ اظہارِ محبت

آپ کی بہن

(آبادی بانو بیگم عبدالعلی)

علی برادران کی نظربندی کا مسئلہ

مسٹر گھاٹے کا خط، مسٹر مونٹیگو کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھندواڑہ ۱۹۰۵ر دسمبر ۱۷ء

مکرمہ! جس دن سے میں نے اخبارات میں آپ کا وہ بیان پڑھا ہے جو آپ
محمد علی و شوکت علی صاحبان کی رہائی کے متعلق اپنی اور ہزایکسی لینسی وائسرائے اور دیگر
انتظامی کونسل کی ملاقات کے متعلق شائع کرایا ہے، میرا خیال تھا کہ میں آپ کو گورنمنٹ
طرزِ عمل کے متعلق مفصل اور مرتبہ حالات لکھوں جو حکومت نے ان صاحبوں کی آزادی کے
متعلق اختیار کیے ہیں، اس لیے کہ آپ کے بیان کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ
کے بہترین دوستوں کے لیے اس قسم کے مفصل حالات کا بیان کرنا ضروری ہے جب سے
دونوں اصحاب یہاں آئے ہیں بحیثیت مشیر قانونی کے اسی دن سے میری ان کی ملاقات
ہونے لگی۔ لیکن میں ان کے آنے سے پہلے بھی ان کے دوست قاضی عبدالولی خان سے
سے کچھ دنوں پہلے اس جگہ نظربند تھے ان کے بہت سے حالات سن چکا تھا۔ پس میرے
میں خیال پیدا ہوا کہ میں شاید بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں ان کی نظربندی کے
بہتر لکھ سکوں گا۔

لیکن چھندواڑہ ڈسٹرکٹ کانفرنس کے انتظامات نے مجھے غیر معمولی طور پر

رکھا اور اس زمانہ میں جبکہ کام بہت کم ہے ایک قانون پیشہ کو بہت کم فرصت ملتی ہے۔ اسی وجہ سے میں آپ کو یہ خط اس قدر تاخیر کے ساتھ لکھ سکا۔ تاہم دیر ہی سہی مگر میں محمد علی اور شوکت علی صاحبان کے معاملہ کو اچھی طرح سمجھا سکوں گا گویا میں نے اس معاملہ پر اس طرح غور کیا ہے جس طرح کہ ایک وکیل اپنے موکل کے کاغذات پر غور کرتا ہے آپ کے بیان میں (جو شائع ہوا ہے) آپ فرماتی ہیں کہ وائسرائے اور ان کی کونسل:

"خوشی سے دونوں بھائیوں کو آزاد کر دیتی اگر جنگ نے موجودہ نازک صورت اختیار نہ کر لی ہوتی۔ روس کی تباہی نے مشرقی محاذ کو کمزور کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے جرمنوں کی اور جرمنوں کی وجہ سے ترکوں کی ہمت بڑھ گئی ہے۔ مسٹر محمد علی ترکی کے ساتھ جو پُرزور گو مجہول ہمدردی ظاہر کر چکے ہیں میرے خیال میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر کے بموجب اس خطرہ سے خالی نہ تھی کہ کہیں یہ مجہول ہمدردی عملی صورت اختیار نہ کرے۔"

اُس خط میں جو ان دونوں صاحبوں کی والدہ نے آپ کو لکھا تھا اور میں نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے ان تعلقات پر جو دنیا کے اور ترکی کے اور سلطان ترکی کے بحیثیت خلیفۃ المسلمین ان سے ہیں اور نیز روحانی اور دنیاوی اطاعت گزاری کے سوال پر کافی بحث کی گئی تھی، اس لیے مجھے اب پھر اس بحث پر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، تاہم گورنمنٹ کے طرزِ عمل اور نقطۂ نظر پر بحث کرنا جو میرے خیال میں وقتاً فوقتاً بدلتا رہا ہے اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کے باہمی تعلقات پر بحث ضروری ہے،

بدقسمتی سے جب ۱۵ مئی ۱۵ء کا حکم نظر بندی صادر کیا گیا تو ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی تھی، لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ اس وقت جنگ کی وہ نازک صورت موجود تھی جس کو ان کی نظر بندی کا باعث بتایا جاتا اسی طرح جس طرح کہ آج جنگ کی

موجودہ نازک صورت" کو ان کی نظر بندی جاری رکھنے کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ میں نے ... ہی کے ہندوستانی اخبارات میں سر ویلنٹائن شیرول کا وہ خط پڑھا، جو لندن ٹائمز میں شائع ہوا ہے۔ اس خط میں صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"جرمنی کی جانب سے ٹرکی کے جنگ میں شریک ہونے پر شروع سے بہت زور دیا گیا ہے اور اسلامی شورش انگیزوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے محسوسات کو بھڑکانا چاہا، گو شروع میں ان کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی مگر لارڈ ہارڈنگ، ان کے دو مشہور لیڈروں یعنی محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی کو نظر بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔"

میں نہیں جانتا کہ سر ویلنٹائن کا ان بھائیوں کی نظر بندی کو لارڈ ہارڈنگ کی کارروائی جتانا کس حد تک بجا و درست ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ مجھے بتایا گیا کہ لارڈ ہارڈنگ نے ایک معزز مسلمان لیڈر سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس معاملہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور اگر ہوتا تو وہ ایسی کارروائی ہرگز نہ کرتے۔ لیکن چونکہ وہ لوکل گورنمنٹ نے احکام جاری کر دیے اس کے بعد مداخلت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لئے کہ لوکل گورنمنٹ کو قانون تحفظ ہند کے تحت جو گورنمنٹ ہند نے بنایا تھا لوگوں کو نظر بند کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا بہرحال مجھے اس وقت اس بحث سے کوئی تعرض البتہ ہیں، یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جرمنی کے ساتھ ٹرکی کی شرکت سے ان جاہلوں نے کس طرح کام لیا اور کس طرح اس واقعہ سے مسلمانوں کے محسوسات کو بھڑکایا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ مسٹر شوکت علی سے، وہ صاف کی قابل تعریف سرکاری ملازمت کے بعد کنارہ کش ہو کر آج تک کبھی سیاسی معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ انہوں نے صرف علی گڑھ کالج، اور لڈیا اور ٹرکی معاملات میں دلچسپی ظاہر کی، بعد کو وہ انجمن خدام کعبہ کے کام میں خاص دلچسپی لینے لگے تھے جو خالص مذہبی انجمن تھی، جیسا کہ خود اس کے نام سے ...

نے اعتراف کیا تھا۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس انجمن پر بھی شبہات کیے جاتے تھے تاہم کوئی شخص جو اس کے مقاصد اور اس کے طریقِ کار سے واقف ہوگا، ان کی خدمات کو دیکھنے کے بعد جو اس انجمن نے مقامات مقدسہ جانے والے زایرین کی کی ہیں اس کے خالص مذہبی حیثیت کے متعلق ذرہ برابر شبہ نہیں کر سکتا،

رہے مسٹر محمد علی، ان کے انگریزی کے ہفتہ وار اخبار کامریڈ کی اشاعت تو اسی زمانے میں بند ہوگئی تھی جبکہ ترکی جرمنی کے ساتھ ہو کر جنگ میں شریک ہوئی۔" گورنمنٹ نے ان کے مضمون موسومہ "پارلس آف دی ٹرک" کی وجہ سے جو ایک ماہ پیشتر شائع ہوا تھا ان کے پریس کی ضمانت ضبط کرلی تھی باوجودیکہ انگلستان کے معزز اخبارات نے اور رائے عامہ نے بھی اُس مضمون کو بہت پسند کیا تھا اور اُس کے وفادارانہ لہجہ کی تعریف کی تھی۔

بہرحال یہ تو امر یقینی ہے کہ اس وقت کم از کم کامریڈ موجود نہ تھا جس ذریعہ سے ترکی کی شرکت جنگ کو شورش پھیلانے کا ذریعہ بنایا جاتا۔ یہ سچ ہے کہ ان کا روزانہ اخبار ہمدرد چند ہفتوں کے بعد پھر جاری ہوگیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ حکام نے اس اخبار کے لہجہ کے متعلق کبھی کوئی تنبیہ نہیں کی۔ بلکہ گورنمنٹ نے جو جنگ کے متعلق اس کے مضامین کی تعریف کی تھی اور اردو پریس کے متعلق انہوں نے جو اعتراضات کیے تھے ان سے ہمدرد کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس مضمون کی وجہ سے مسٹر محمد علی کے پریس کی ضمانت ضبط ہوئی تھی وہ مضمون ہمدرد میں شائع نہیں ہوا تھا۔ پس یہ تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ مسٹر محمد علی اپنے اخبار کے ذریعہ سے ترکی کی شرکت جنگ کو شورش پیدا کرنے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ اس لیے بقول سر ویلنٹائن چرول، لارڈ ہارڈنگ ان کو نظر بند کرنے پر مجبور ہوئے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی پبلک تقریروں میں ایسا کیا تھا۔ جنگ کے متعلق صرف ایک تقریر ٹاؤن ہال میں انہوں نے کی تھی جس میں انہوں نے لوگوں سے اپیل

کی تھی کہ وہ گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کریں، اسی جگہ ایک دوسرے جلسہ میں جو انہوں نے تقریر کی اس میں لارڈ ہارڈنگ کی توسیع میعاد کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ تیسری تقریر انہوں نے دہلی میں کی اس میں مسٹر گوکھلے کی وفات پر اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ چوتھی اور آخری تقریر میں انہوں نے اہل دہلی کی طرف سے مسٹر گاندھی کا خیر مقدم کیا گیا تھا اور لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ مسٹر گاندھی کے قدم بقدم چلیں۔ پس ان کی تقریروں کا جنگ کے متعلق اور ہندوستانی سیاسیات کے متعلق سلسلہ یہیں ختم ہو جاتا ہے اور میں نے خاص طور سے اس بات کو تحقیق کیا ہے کہ ان سب تقریروں میں انہوں نے کبھی اشارتاً بھی جرمنی کے ساتھ ترکی کی شرکت جنگ کا ذکر نہیں کیا۔

لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک موقع پر ایک سرکاری افسر کے متعلق بہت کچھ کہا گیا جس نے ۱۹۱۳ء میں جب مسٹر محمد علی معہ آنریبل سید وزیر حسن سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ انگلستان میں تھے تو وہاں اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اس جماعت میں شریک ہوں جس کا نام اب انڈو برٹش ایسوسی ایشن ہے اور حکومت ہند کے اینگلو انڈین عمال کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور مسٹر علی امام کے مقابلہ میں کارروائی کریں تاکہ ۱۹۱۱ء کے دربار میں جو [illegible] تبدیلیاں کی گئی تھیں وہ پھر لوٹا دی جائیں۔ یہ افسر اعلیٰ جس کی قابل اعتراض تجویز کا مسٹر محمد علی نے اپنی تقریر میں ذکر کیا تھا، سر چارلس کلیولینڈ ڈائرکٹر جنرل، سی، آئی، ڈی تھے اور یہ واقعہ نہایت قابل غور ہے کہ اس سازش میں (جو مفاد وطن کے خلاف تھی) ان کے ساتھ شریک ہونے سے انکار کر دینے کے بعد مسٹر محمد علی نے محسوس کیا کہ ان کے متعلق سر چارلس کا طرز عمل بالکل بدل گیا۔

اب میں اُس زمانہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جبکہ چیف کمشنر دہلی نے پہلی دفعہ نظر بندی کا حکم دیا۔ گیا تھا مرض ذات الجنب میں مسٹر محمد علی کو مبتلا ہوئے۔ ایک سال سے زیادہ ہو چکا تھا اور جب اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ شروع ہوئی ہے تو اس

بعد ہی وہ اس قدر علیل ہو گئے کہ چند ہفتوں تک بستر سے بھی اٹھنے کے قابل نہ تھے انکی صحت کسی قدر درست ہو چکی تھی کہ ان کے اہلیہ جو کئی ماہ سے بیمار تھیں بہت سخت علیل ہو گئیں۔ جب ذرا ان کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی تو مسٹر محمد علی اپنے پریس کی ضبطی تمامت کے متعلق قانونی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ تمام کام مارچ ۱۹۱۵ء میں ختم ہوئے اور ڈاکٹروں نے دیکھا کہ روز روز کی پریشانیوں اور کثرت کام نے ان کی صحت کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔ پس انہوں نے مسٹر محمد علی کو تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے فوراً تمام کام چھوڑ کر پورا آرام نہ لیا تو وہ زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے مع اپنے اہل و عیال کے دہلی چھوڑنے کا قصد کر لیا۔

پس مسٹر شوکت علی سے یہ قرارداد کرنے کے بعد کہ وہ اپنے تعلیمی اور مذہبی کام کے علاوہ جو بجائے خود بہت تھا۔ ہمدرد کے انتظامات کی نگرانی بھی کریں گے مسٹر محمد علی اخباروں کے ایڈیٹوریل کام کو اپنے چار پانچ سب ایڈیٹروں (جن میں مرحوم غلام حسین بھی تھے) کے سپرد کر کے وسط اپریل میں رام پور چلے گئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قانون تحفظ ہند صرف ایک ہی ماہ پہلے پاس ہو چکا تھا اور یہ خیال کرنا بالکل قرین عقل ہے کہ اگر مسٹر محمد علی اور ان کے بھائی کا آزاد رہنا امن عامہ کے لیے اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ اب گورنمنٹ بتاتی ہے تو مسٹر محمد علی کو کبھی ایک ماہ تک دہلی میں آزاد رہنے اور اس کے بعد ایسی جگہ چلے جانے کا موقع نہ دیا جاتا جہاں وہ گورنمنٹ اور قانون تحفظ ہند کے دسترس سے باہر تھے!

گورنمنٹ ہند یا دہلی کی لوکل گورنمنٹ کو ان کی نظربندی کے متعلق کچھ زیادہ عجلت مدنظر تھی تاہم دوسرے لوگ اپنے کام سے غافل نہ تھے۔ رامپور آنے کے چند ہی روز بعد انسپکٹر جنرل پولس صوبجات متحدہ جنہوں نے مسجد کانپور کے معاملہ میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور اس کے بعد مسٹر محمد علی کی کھلم کھلا مخالفت کی تھی ان کے پیچھے پیچھے رام پور پہنچے

انھوں نے ہز ہائینس نواب صاحب رام پور سے ملاقات کی اور اس ملاقات کے بعد ہی ہز ہائینس نے مسٹر محمد علی کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ رامپور ہی میں رہیں اور ہمدرد کو بند کردیں جس میں اسی زمانہ میں مسجد کانپور کے متعلق کچھ مراسلتیں شائع ہوئی تھیں۔ اسی دن شام کو ہز ہائینس کے سامنے انسپکٹر جنرل نے مسٹر محمد علی سے ان مراسلتوں کے متعلق جو مسجد کانپور کی نسبت ہمدرد میں شائع ہوئی تھیں اور نیز اسی واقعہ کے متعلق ہمدرد و کامریڈ کے مضامین، بعد کے واقعات اور مسٹر وزیر حسن کے ساتھ مسٹر محمد علی کے سفر انگلستان کے متعلق (جس کا مقصد یہ تھا کہ مسجد کو واگذاشت کرایا جائے اور جو لوگ جیل خانہ میں تھے ان کو رہا کرایا جائے) گفتگو کی۔

اس گفتگو میں ٹرکی کی شرکت جنگ کے ذریعہ سے شورش پھیلانے کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا گیا بلکہ جو کچھ کہا گیا (اور بہت کچھ کہا گیا) وہ مسٹر محمد علی کی اس نکتہ چینی کے متعلق تھا جو مسجد کانپور کے متعلق لوکل افسروں اور سر جیمس مسٹن کے طرز عمل نیز لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کی نسبت کی گئی تھی۔

ان واقعات کو سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ انسپکٹر جنرل صاحب کے آنے کا مقصد کیا تھا۔ گو وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوئے۔ رام پور کے گرم موسم میں مسٹر محمد علی کی صحت درست نہ ہو سکی اور ہز ہائینس نے ان کو منصوری جاکر رہنے کی اجازت دے دی جہاں ان کے مشیر خاص اور دوست ڈاکٹر انصاری نے ایک زنانہ گھر بھی ان کے لیے کرایہ پر لیے تھے۔ ان کے اور مسٹر شوکت علی کے ہمراہ جنہوں نے ہز ہائینس سے بہت کچھ سعی کر کے ان کو اجازت دلوائی تھی۔ مسٹر محمد علی دہلی واپس آئے اور دوسرے ہی دن چیف کمشنر دہلی نے دونوں بھائیوں کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے۔ واقعات کا اندازہ صاف بتاتا ہے کہ انسپکٹر جنرل پولیس صوبجات متحدہ جس کام کو پوری طرح سے انجام نہ کرسکے اُس کو دہلی کی گورنمنٹ نے بلا واسطہ پورا کر دیا۔ اس طرح بخوبی سمجھ میں آسکتا

ہے کہ ترکی کی شرکت جنگ سے فائدہ اُٹھا کر شورش پیدا کرنے کا الزام دونوں بھائیوں کی نظر بندی سے اتنا ہی غیر متعلق ہے جتنا کہ روس کے مصائب جرمنوں اور ترکوں سے غیر متعلق ہیں، بلکہ واقعات سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حادثہ کانپور اور اینگلو انڈین حکام کی خواہش کے خلاف ایک جھگڑے کا فیصلہ جسے اسی وائسرائے نے کیا جو ۵ یا ۶ سال پہلے بنگالیوں کے ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر ان حکام کو ناراض کر چکا تھا۔ دونوں بھائیوں کی نظر بندی کا اصلی باعث تھا۔ ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ لیکن نظر بندی سے پہلے کے واقعات کا نتیجہ میری نظر میں تو یہی نکلتا ہے۔

حکومت دہلی کے احکام میں کسی جرم یا قصور کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ ایک مہینہ کے بعد دونوں بھائی لینسڈ ڈاؤن بھیج دیے گئے جو صوبجات متحدہ میں ایک پہاڑ ہے، جہاں گورکھا اور گڑھوال فوج رہتی ہے اور یہاں سر جیمس مسٹن کے حسب الحکم نظر بند کر دیے گئے جب ان صاحبوں نے سر جیمس مسٹن سے درخواست کی کہ ان کو ان کا جرم بتایا جائے تو جواب ملا کہ لفٹنٹ گورنر ان سے اپنے احکام کے وجوہ کے متعلق کوئی گفت و شنید کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔" تین ماہ بعد قانونی کونسل میں آنریبل سید رضا علی نے لوکل گورنمنٹ سے سوال کیا کہ "اس جرم یا کام کی نوعیت واضح طور پر بتائی جائے۔" جس کی بنا پر نظر بندی کے حکم صادر کرنے مناسب سمجھے گئے اس کا جواب آنریبل موصوف کو یہ ملا کہ:۔

"نظر بندی کا حکم دفعہ ۳ قانون تحفظ ہند کے تحت میں صادر کیا گیا ہے
لفٹنٹ گورنر اس سلسلے میں کچھ کہنے کے لیے تیار نہیں۔"

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ موسم سرما شروع ہو جانے کی وجہ سے نظر بندوں کو چھندواڑے بھیج دیا گیا۔ لیکن پہنچنے سے ہی مسٹر بیلی نے جنہوں نے نظر بندی کا ابتدائی حکم دیا تھا چیف کمشنر صوبجات متوسط کو ایک خط بھیج دیا جس میں نظر بند بھائیوں کے متعلق آپ نے رائے ظاہر کی دو ورکل حکومت کا تجربہ ہو جانے کے بعد نئی لوکل حکومت سے جس کے

انتدا میں وہ چیلنج دیے گئے تھے ان کا اپنے جرم کی نوعیت دریافت کرنا ...
لیکن جب اگست ۱۹۱۶ء میں بنگال کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ وہاں ...
شخص ایسا نظربند نہیں کیا گیا جس کو اس کے جرم کی نوعیت نہ بتائی گئی یا جس کو ...
پیش کرنے کا موقع نہ دیا گیا ہو تب پھر اس صوبہ کے لوکل گورنمنٹ سے درخواست کی ...
وہ ان بھائیوں کو مطلع کرے کہ آیا یہی طریقہ اس صوبہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے یا ...
لیے کہ نظربند قدرتاً اپنے جرم کی نوعیت معلوم کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ بعض ...
کی وجہ سے گورنمنٹ کو ان کے متعلق شبہات پیدا ہوئے ہوں تو وہ صفائی پیش کر ...

اس درخواست کا یہ حیرت انگیز جواب ملا۔ کہ چیف کمشنر نہیں سمجھ سکتے کہ ...
ان کے سوال کا جواب دیں۔ انہوں نے پھر چیف کمشنر کو لکھا کہ ان کا خیال یہ ہے کہ یہاں ...
طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو بنگال میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے شاید غلطی سے ان کو ...
جرم کی اطلاع نہیں دی گئی نہ ان سے جواب لیا گیا اب وہ پھر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ...
جرم کیا ہے اور جو الزامات ان پر لگائے گئے ہوں ان کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ ...
کوئی جواب گورنمنٹ نے نہیں دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے گورنمنٹ ہمیشہ اس قدر خاموش نہ ...
چنانچہ نومبر ۱۹۱۶ء میں جب دہلی کی انتظامی رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں تحفظ کے عنوان سے ...
باب تھا اس کے تحت حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے

"اسی ماہ میں دہلی، محمد علی اور شوکت علی کو نظربند کرنا ضروری معلوم ہوا اس لیے کہ ...
برٹش گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت وتلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت ...
پر برا اثر ڈال رہی تھیں" (رپورٹ انتظامی صوبہ دہلی بابت سال ۱۹۱۶ء ...
باب (۲) پیرا (۱۰۰) صفحہ (۱۱۷)

اب پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ نظربندی کے وجوہ کیا تھے ہیں جن کا یقین حکام پبلک ...
چاہتے ہیں اور مجرموں کے لیے جو الفاظ عدالتوں میں استعمال کیے جاتے ہیں اگر ان کو ...

جائے تو گویا یہ پہلی رپورٹ" ہے جو بے قیمت نہیں کہی جاسکتی اُس کی قیمت اور بھی بڑھ گئی جبکہ چار ماہ بعد گورنمنٹ ہند کے ہوم ممبر نے کونسل میں ایک تقریر فرمائی۔ ۲۱، فروری ۱۹۱۸ء کو امپیریل کونسل میں آنریبل مسٹر دادا بھائی نے ایک رزولیوشن پیش کیا تھا جس میں سفارش کی تھی کہ گورنمنٹ ہند قواعد تحفظ ہند پر نظرثانی کرے تاکہ ہر صورت میں ان لوگوں کے معاملات پر غور کرنے کے لیے جن کی نقل وحرکت پر اس قانون کے تحت پابندیاں عائد کی گئی ہوں۔ ایک خاص عدالت بنائی جائے۔"

آنریبل مسٹر چاندا نے ایک ترمیم پیش کی جس میں اس خاص عدالت کی ہیئت ترکیبی بتائی گئی تھی جو یہ تھی کہ "ایک نگراں کمیٹی بنائی جائے جس میں ایک ہائیکورٹ کا جج جو بہتر یہ ہے کہ ہندوستانی ہو، ایک ہندوستانی قانون پیشہ جو وکیل سرکار نہ ہو اور ایک سشن جج ممبر ہوں۔ اور شرط یہ ہو کہ گرفتاری کے بعد وہ الزامات جن کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی ہے یا نظربندی کے احکام صادر کیے گئے ہیں بتائے جائیں اور ان کارروائیوں کو ظاہر کیا جائے جو قابل گرفت سمجھی گئی ہیں نیز ان کا محل وقوع اور وقت بھی بتایا جائے۔ تاکہ ان لوگوں کو جن پر الزام لگایا جاتا ہے الزاموں کی نوعیت معلوم ہو جائے اور ان کو موقع ملے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا تحریری جواب مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں اور مجسٹریٹ آخری حکم دے نیز یہ کہ ان کو قانونی مشورہ حاصل کرنے کا معقول موقع دیا جائے۔ بہت سے غیر سرکاری ممبروں نے اس تجویز کی تائید میں تقریریں کیں۔ چنانچہ آنریبل مسٹر مظہر الحق نے فرمایا تھا کہ:۔

"میں نہایت سختی سے اس طرز عمل پر اعتراض کرتا ہوں جو بعض لوکل گورنمنٹوں نے اس قانون کے نفاذ کے متعلق برتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ باا ثر لوگ وہ لوگ جن کو ان کے ہم قوم عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پولیس ان کو دبوچ لیتی ہے۔ اور وہ فوراً نظربند کر دیے جاتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ان کا قصور کیا ہے۔ اگر لوگ ان کے قصور کو جانتے تو شاید وہ مطمئن بھی ہو جاتے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ گورنمنٹ کے ذمہ دار افسران

ابتدا میں وہ بھینک دیے گئے تھے ان کا اپنے جرم کی نوعیت دریافت کرنا
لیکن جب اگست ۱۹۱۶ء میں بنگال کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ وہاں
شخص ایسا نظر بند نہیں کیا گیا جس کو اس کے جرم کی نوعیت نہ بتائی گئی یا جس کو
پیش کرنے کا موقع نہ دیا گیا ہو تب پھر اس صوبہ کے لوکل گورنمنٹ سے درخواست کی
وہ ان بھائیوں کو مطلع کرے کہ آیا یہی طریقہ اس صوبہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے یا نہیں
لیے کہ نظر بند قدرتاً اپنے جرم کی نوعیت معلوم کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ بعض
کی وجہ سے گورنمنٹ کو ان کے متعلق شبہات پیدا ہوئے ہوں تو وہ صفائی پیش کر
اس درخواست کا یہ حیرت انگیز جواب ملا۔ کہ چیف کمشنر نہیں سمجھ سکتے کہ کس
ان کے سوال کا جواب دیں۔ انہوں نے پھر چیف کمشنر کو لکھا کہ ان کا خیال یہ ہے کہ یہاں
طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو بنگال میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے شاید غلطی سے ان کو
جرم کی اطلاع نہیں دی گئی تو ان سے جواب لیا گیا اب وہ پھر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ
جرم کیا ہے اور جو الزامات ان پر لگائے گئے ہوں ان کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ اس
کوئی جواب گورنمنٹ نے نہیں دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے گورنمنٹ ہمیشہ اس قدر خاموش نہیں
چنانچہ نومبر ۱۹۱۶ء میں جب دہلی کی انتظامی رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں تحفظ کے عنوان سے
باب تھا اس کے تحت حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے

"اسی ماہ میں (مئی) محمد علی اور شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا اس لیے کہ
برٹش گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت
پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں" (رپورٹ انتظامی صوبہ دہلی بابت سال ۱۹۱۱ء
باب (۲) پیرا (۶۰) صفحہ (۱۱۷)

اب پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ نظر بندی کے وہ کیا وجوہ ہیں جن کا یقین حکام پبلک کو
چاہتے ہیں اور مجرموں کے لیے جو الفاظ عدالتوں میں استعمال کیے جاتے ہیں اگر ان کا

جانے تو گویا یہ پہلی رپورٹ" ہے جو بے قیمت نہیں کہی جاسکتی اُس کی قیمت اور بھی بڑھ گئی جبکہ چار ماہ بعد گورنمنٹ ہند کے ہوم ممبر نے کونسل میں ایک تقریر فرمائی۔ ۲۱، فروری ۱۹۱۸ء کو امپیریل کونسل میں آنریبل مسٹر دادا بھائی نے ایک رزولیوشن پیش کیا تھا جس میں سفارش کی گئی تھی کہ گورنمنٹ ہند قواعد تحفظ ہند پر نظرثانی کرے تاکہ ہر صورت میں ان لوگوں کے معاملات پر غور کرنے کے لیے جن کی نقل و حرکت پر اس قانون کے تحت پابندیاں عائد کی گئی ہوں۔ ایک خاص عدالت بنائی جائے۔"

آنریبل مسٹر سچانند نے ایک ترمیم پیش کی جس میں اس خاص عدالت کی ہیئت ترکیبی بتائی گئی تھی جو یہ تھی کہ ایک نگران کمیٹی بنائی جائے جس میں ایک ہائیکورٹ کا جج جو بہتر یہ ہے کہ ہندوستانی ہو، ایک ہندوستانی قانون پیشہ جو وکیل سرکار نہ ہو اور ایک سشن جج ممبر ہوں۔ اور شرط یہی ہو کہ گرفتاری کے بعد وہ الزامات جن کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی ہے یا نظربندی کے احکام صادر کیے گئے ہیں بتائے جائیں اور ان کارروائیوں کو ظاہر کیا جائے جو قابل گرفت سمجھی گئی ہیں نیز ان کا محل وقوع اور وقت بھی بتایا جائے۔ تاکہ ان لوگوں کو جن پر الزام لگایا جاتا ہے الزاموں کی نوعیت معلوم ہو جائے اور ان کو موقع ملے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا تحریری جواب مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں اور مجسٹریٹ آخری حکم دے نیز یہ کہ ان کو قانونی مشورہ حاصل کرنے کا معقول موقع دیا جائے۔ بہت سے غیر سرکاری ممبروں نے اس تجویز کی تائید میں تقریریں کیں۔ چنانچہ آنریبل مسٹر مظہر الحق نے فرمایا تھا کہ:۔

"میں نہایت سختی سے اس طرزِ عمل پر اعتراض کرتا ہوں جو بعض لوکل گورنمنٹوں نے اس قانون کے نفاذ کے متعلق برتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ با اثر لوگ، وہ لوگ جن کو ان کے ہم قوم عزت اور وقار کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پولیس ان کو دبوچ لیتی ہے اور وہ فوراً نظر بند کر دیے جاتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ان کا قصور کیا ہے، اگر لوگ ان کے قصوروں کو جانتے تو شاید وہ مطمئن بھی ہو جاتے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ گورنمنٹ کے ذمہ دار افسران

مظہر الحق کی تقریر کا اس طرح جواب دیا:-

"وہ نظر بند دو قسم کے ہیں، میں خصوصیت کے ساتھ مسٹر مظہر الحق کے تقریر کا جواب دیتا ہوں۔ نظر بند دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ لوگ ہیں جو صاف صاف اور کھلم کھلا ہز مجسٹی کی رعایا کے درمیان بددلی کی تلقین کر رہے ہیں یا شورش اور بدامنی پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے طرز عمل کو نہایت مجنونانہ کہا جا سکتا ہے اور اس طرح وہ گویا اپنے طرز عمل سے مسلسل ملک معظم کی گورنمنٹ اور گورنمنٹ کے افسران کو تکلیف پہنچا رہے ہیں اس حالت میں جبکہ لیگ کھلم کھلا تقریریں کر رہے ہیں یا مضامین لکھ رہے ہیں صرف اس سوال کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ان کے طرز عمل سے امن عامہ کو نقصان پہنچ سکتا ہے یا لوگ مشتعل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اس سوال کو طے کرنے کے لیے کسی کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ انتظامی گورنمنٹ طے کرے گی کہ جو معلومات اُس کے سامنے ہیں اس کے اور نیز اپنے افسروں کے تجربہ کے بنا پر اس امر کا فیصلہ کرے گی۔ پس ذمہ داری انتظامی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور وہ اس ذمہ داری کو باہر کے لوگوں پر نہیں چھوڑ سکتے خواہ وہ قانون پیشہ ہوں یا غیر قانون پیشہ۔ دوسری قسم نظر بندوں کی جن کا ذکر میں نے کیا ہے خفیہ سازش کرنے والے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو برسوں سے ڈیسی کارروائیاں کر رہے ہیں ان میں سے بہت سے مختلف بہروپ بھر کر اور مختلف نام رکھ کر ملک میں پھر رہے تھے۔ بہت سے واقعات آہستہ آہستہ جس قدر تحقیقات ہوتی گئی اور یہ ان لوگوں میں سے ثابت ہوتی گئی جو سازشوں میں غرق تھے۔ ہر حالت میں پولیس کی معلومات کو انتظامی افسروں نے بنظر تعمق دیکھ لیا ہے بنگال میں اس کام کے لیے خاص طور پر افسر منتخب کیے گئے مگر شاید بعض

نے جن پر پبلک کو اعتماد ہے ان کے معاملات پر غور کیا ہے تو وہ ان نظر بندیوں کی پیروی
نہ کرتے۔ جناب والا میری قوم یعنی مسلمانوں کو اپنے معاملہ میں سب سے زیادہ نقصان
اٹھانا پڑا ہے۔ بااثر حضرات اور وہ حضرات جن کو تمام قوم انتہائی عزت اور وقعت کی نگاہ
سے دیکھتی ہے بند کر دیے گئے اور تمام قوم ناواقف ہے کہ آخر وہ کیوں نظر بند کیے
گئے ہیں اور ان کا کیا قصور ہے۔

اگر ہم ان کے قصور سے واقف ہوتے اور ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ ان کے معاملہ
ذمہ دار افسران حکومت نے غور کیا ہے تو شاید ہمیں اعتراض نہ ہوتا۔ اب صورت حال
کیا ہے؟ میں کہتا ہوں اور یہ کہتے ہوئے اپنی پوری ذمہ داری کو محسوس کرتا ہوں کہ
قوم کا بہت بڑا حصہ ان نظر بندیوں سے ناراض ہے۔ مجھے ان مسلمان لیڈروں کے
گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ
ہمیں ان نظر بندوں کے نام لکھ لیں گے، جن کے لیے قوم کا احساس اس قدر زیادہ ہے وہ لوگ
مسٹر محمد علی، مسٹر شوکت علی، مسٹر ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ سب لوگ
ہندوستان میں نہایت وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور بدقسمتی سے
ان کے قصور معلوم نہیں ہیں۔ اگر وہ قصوروار ہیں تو انہیں نظر بند رہنے دیجیے۔ ہم سب
گورنمنٹ کی تائید کریں گے۔ مگر خدا کے واسطے ہمیں ان کا قصور بتایئے اور ان کے نظر
کرنے کی وجہ سے مطلع کیجیے، اگر کوئی مشورہ کی کمیٹی ہوتی جیسی کہ میرے دوست
بھائی یا میرے آنریبل دوست مسٹر چاندا نے تجویز کی تھی اور اس نے اپنی رائے دی
تو میں سمجھتا ہوں کہ تمام قوم مطمئن ہوتی کم از کم ہم لوگوں کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ
حضرات کے خلاف نہایت سخت شبہ یا شہادت موجود ہیں۔"

گزٹ آف انڈیا حصہ ۶ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۱۷ء صفحہ ۲۱۹، ۲۲۰

مسٹر مظہر الحق کے بعد فوراً ہی ہوم ممبر نے تقریر کی اور دوران تقریر میں خاص طور

اصحاب جو گورنمنٹ کی نیک نیتی کا اعتراف کرتے ہیں اور حکومت کی مدد کرنا چاہتے ہیں مجھ سے کہیں کہ ان لوگوں کے خلاف جو معلومات حاصل کی گئی ہے وہ باہر کے کسی بااختیار کمیٹی کے روبرو رکھی جائے تاکہ انتظامی حکومت کی باگ کچی رہے۔ ہزایکسی لنسی گورنر بنگال نے فرمایا ہے کہ ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں اور گورنمنٹ اس تجویز کو منظور نہیں کر سکتی، وہ باہر والوں کے سامنے اس خفیہ معلومات کو نہیں رکھ سکتی جو دشمنوں کی سازشوں کے متعلق اس کے قبضہ میں ہے خواہ ان سازشوں کا تعلق مشرق بعید سے ہو، یا جرمنی سے ہو یا سرحد پار کے ملک سے ہو، یہ باتیں بیان نہیں کی جاسکتیں نہ پبلک میں لائی جا سکتی ہیں لیکن میں اتنا کرنے پر راضی ہوں کہ دوسری قسم کے ہر معاملہ میں (ضروری نہیں نظر بندی سے پہلے ایسا کیا جائے) معاملات پر ایک یا ایک سے زیادہ تجربہ کار جج غور کر لیا کریں۔ تاکہ گورنمنٹ عجلت کے ساتھ ایسی معلومات کی بنا پر کارروائی نہ کرے جس میں زیادہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔"

(گزٹ آف انڈیا حصہ ۶، ۲۳ مارچ ۱۹۲۱ء صفحہ ۲۲۵-۲۲۶)

بدقسمتی سے مندرجہ بالا اقتباسات بہت طویل ہیں لیکن ان کو پڑھنے کے بعد کسی شخص کے دل میں یہ شبہ باقی نہیں رہ سکتا کہ گورنمنٹ مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی کے قصور کی نوعیت کے متعلق پبلک کے سامنے کیا خیال پیش کر رہی تھی ان دونوں صاحبوں کو پہلی قسم میں رکھا گیا تھا۔ مسٹر اظہر الحق نے اپنی تقریر میں ان صاحبوں کا نام لیا تھا اور دریافت کیا تھا کہ ان کا قصور کیا ہے اور خواہش کی تھی کہ ان کے معاملہ کے متعلق اس قسم کی ایک کمیٹی جیسی کہ مسٹر چاندا نے تجویز کی تھی اپنی رائے دے گویا مسٹر مظہر الحق کو بتا دیا گیا کہ جن لوگوں کا انہوں نے نام لیا تھا وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ کھلم کھلا کر رہے تھے دلیں یہاں

قسم کے اندر آتے ہیں)

اب رہا یہ سوال کہ وہ کھلم کھلا ہز مجسٹی کی رعایا کے درمیان بد دلی کی تلقین کر رہے تھے یا شورش اور بدامنی پیدا کر رہے تھے" یا خطرناک مجنونانہ کارروائیاں کر رہے تھے یا صرف اپنے طرزِ عمل سے ملک معظم کی گورنمنٹ کو تکلیف پہنچا رہے تھے۔ شاید خاص طور پر گورنمنٹ کے افسروں کی تکلیف کا باعث ہو رہے تھے یا شاید دشمنوں کو نفع پہنچا رہے تھے۔ بہرحال جو صورت بھی ہو یہ وہ لوگ تھے جو کھلم کھلا تقریریں کر رہے تھے اور مضامین لکھ رہے تھے اور صرف سوال یہی باقی تھا کہ وہ مجرمانہ کارروائی کر رہے تھے یا نہیں اور امن عامہ کے لیے ان کی کارروائی مضر تھی یا نہیں لیکن اقبال سر رنجیا لڈ کنڑیڈک اس کا فیصلہ کرنے کے لیے تم کو غیر سرکاری کمیٹی کی ضرورت نہیں ہے" انہوں نے کونسل کو خاص طور پر یہ بھی یاد دلایا کہ:

"ایکٹ کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ جو شخص نظر بند کیا جائے وہ ضرور مجرم بھی ہو۔ اُس نے ضرور کوئی جرم بھی کیا ہو۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا یقین کر لینا چاہیے کہ اس نے کوئی کارروائی ایسی کی ہے یا کرنے والا ہے جو ملک کے امن کے لیے مضر ثابت ہو۔"

اس قسم کے نظر بندوں سے بالکل مختلف دوسری قسم کے نظر بند وہ ہیں جن کا ذکر مسٹر مظہر الحق نے نہیں بلکہ دوسرے مقررین نے کیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو برسوں سے کارروائیاں کر رہے ہیں اور مختلف بہروپ بھر کر اور مختلف نام رکھ کر ملک میں پھر رہے ہیں" اور جن کے متعلق چھپے ہوئے اسلحہ اور مشتبہ کاغذات دستیاب ہوئے ہیں اور جن کی نسبت گورنمنٹ کے قبضہ میں ایسی معلومات ہیں جو دشمن کی سازشوں کا پتہ دیتی ہیں، خواہ ان سازشوں کا تعلق مشرق بعید سے ہو یا جرمنی سے ہو یا سرحد پار کے ملک سے ہو۔" یہ واقعات" باہر والوں کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں، نہ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ نہ پبلک میں لائے جا سکتے ہیں"

برخلاف اس قسم کے جبریہ میں شوکت علی و محمد علی، مولانا ابو الکلام آزاد اور ظفر علی خاں (یہ

اب آزاد کر دیے گئے) صاحبان داخل ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں پہلے ایک شخص کے خلاف واقعات کو تحقیق کرنا پڑتا ہے۔ پیشتر اس سے کہ ملک کے لیے اس کا وجود خطرناک سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے اور اس قسم کے اشخاص کے متعلق ہوم ممبر نے وعدہ کیا تھا کہ تمام کاغذات پر ایک یا ایک سے زیادہ جج غور وخوض کریں گے تاکہ کسی ایسی حالت میں جبکہ شبہات زیادہ قوی نہ ہوں، حکومت کارروائی کرنے میں عجلت نہ کرے۔

دو باتیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہئیں: اول تو یہ کہ چیف کمشنر دہلی نے جنہوں نے دونوں بھائیوں کو اول نظربند کیا تھا، اس کارروائی کی وجہ یہ بتائی تھی کہ "یہ دونوں گورنمنٹ کے خلاف سخت اور تلخ کارروائیاں کر رہے تھے"۔ دوسرے یہ کہ سر کریڈک نے نظربندوں کو دو اقسام میں تقسیم کر دیا تھا، یہ دونوں باتیں پیش نظر رکھی جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ ۶ ستمبر ۱۹۱۶ء کو ہوم ممبر کس طرح گورنمنٹ کے پوزیشن کو ادھر ادھر کر دیتا ہے۔ یعنی وہ کہہ دیتا ہے کہ "ان واقعات و آراء پر کافی غور کر کے جو تاکہ گئے ہوئے ہیں:" اور "پچھلے کاغذات پر نظرثانی کرنے کے بعد گورنمنٹ نے فیصلہ کیا ہے گویا کہ ۲۱ فروری اور ۲۵ ستمبر کے درمیان یہ دونوں بھائی نظربندوں کی پہلی قسم سے جو بقول ہوم ممبر کھلم کھلا کارروائی کرتے ہیں، دوسری قسم میں "جو خفیہ سازش" کرنے والے کہلاتے ہیں، جن کے لیے مشتبہ کاغذات کی جانچ ضروری ہے" اور جن کے معاملہ کو ججوں کے سامنے پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا قرار پا گئے"۔

اگر میں شاید ان واقعات سے آگے بڑھا جاتا ہوں، ابھی ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ۵ ستمبر کو امپیریل کونسل میں کیا واقعات پیش آئے۔ پبلک کو اور آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کی نظربندی نے گزشتہ جون میں پبلک کے خیالات کو پریشان کر دیا تھا اور تمام ملک میں ناراضگی کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس صاف صریح غلطی نے کہ قانون تحفظ ہند کو جو خاص طور پر دشمنان سلطنت کی ریشہ دوانیوں کو روکنے کے لیے بنایا گیا تھا، ایک ایسے شخص

پر استعمال کیا جائے جو محض اندرونی اصطلاحات کیلئے جدوجہد کر رہا ہو اور اس کی جدوجہد حدود آئین کے اندر ہو لوگوں کو جگا دیا اور ان کے اندر یہ خواہش پیدا کر دی کہ تمام نظر بندوں کے معاملات پر غور کیا جائے اور کسی بات کو سن کر قبول نہ کیا جائے جنھوں نے مسلمانوں نے جن کے محبوب ترین لیڈر پہلے ہی نظر بند تھے، ان کے معاملات پر غور کیے جانے کا مطالبہ کیا اور آپ خود اس امر کی کچھ خواہش رکھتی تھیں کہ تمام رزولیوشن اور درخواستوں میں جو آپ کے اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کے لیے پیش کیے جائیں ان میں مسلمان لیڈروں کا نام انکے ساتھ شامل رکھا جائے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ بمبئی میں لیگ و کانگریس کا مشترکہ جلسہ ہوا اور انتہائی کارروائی یا مفاہمت مجہول کا ذکر آیا لیکن اکتوبر میں بمقام الہ آباد دوسرا جلسہ مفاہمت مجہول کے مسئلہ کو طے کرنے کے لیے منعقد نہ ہونے پایا تھا کہ وزیر ہند نے ہندوستان میں برطانوی پالیسی کے مطمح نظر کے متعلق اپنا مشہور اعلان شائع کر دیا اور وزیر ہند کے دوران قیام ہندوستان میں امن و خاموشی پیدا کرنے کے لیے (تاکہ وہ اصلاحات پر غور کر سکیں، منزل مقصود کی طرف پہلا قدم بڑھایا گیا) درہز ایکسی لنسی وائسرائے نے ایک ایسی تقریر کی جس کا مصالحت آمیز لہجہ بالکل نیا تھا اسی دن آنریبل مسٹر جناح نے حسب ذیل سوال کیا جس کے الفاظ سے ہوم ممبر کے جواب میں آپ کو یاد دلاتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان دونوں بھائیوں کے متعلق حکومت کا خیال وہ ہرگز نہ تھا جو ۲۴ اپریل کو ظاہر ہوا۔ آنریبل مسٹر جناح نے سوال کیا تھا کہ:

"حال کے اعلان پر اور نیز وزیر ہند کی مجوزہ تشریف آوری پر نظر کرتے ہوئے اور ان محسوسات کا لحاظ کرتے ہوئے جو مسز بیسنٹ اور ان کے ہمراہیوں کی نظر بندی سے ملک میں پیدا ہو گئے ہیں کیا گورنمنٹ ہند ان کی آزادی کے مسئلہ پر غور کرے گی؟"

اس کا جواب آنریبل سر ولیم ونسنٹ نے حسب ذیل فرمایا:

"گورنمنٹ ہند حکومت مدراس سے اس امر کی سفارش کرنے کیلیے تیار ہے کہ اس نے مسز بیسنٹ، مسٹر واڈیا اور مسٹر آرنڈیل پر جو پابندیاں تحفظ ہند کے تحت میں عائد کی ہیں ان کو منسوخ کر دے بشرطیکہ یہ صاحب دوران جنگ میں ایجی ٹیشن غیر آئینی اور اشتعال انگیز طریقوں کو اختیار نہ کرنے کا وعدہ کریں، گورنمنٹ ہند نے اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ امید رکھتی ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کا تازہ اعلان اور وزیر ہند کا دو[illegible] پولیٹکل حالات پر اچھا اثر کرے گا۔ اور ان معاملات پر غور و خوض کرنے کا جن کی تحقیقات کے لیے وزیر ہند تشریف لا رہے ہیں خاموشی کے سا[illegible] اور دفعیہ شور و شر کا موقع دیا جائے گا۔"

یہ ہوم ممبر کا مکمل جواب نہیں ہے مگر ہیں صرف اتنے ہی جواب کو دہرانا کافی سمجھ[illegible] ہوں اس لیے کہ مسٹر جناح کے سوال کا جواب اتنا ہی ہے اور اتنے ہی الفاظ اس وقت ضرورت کے لیے کافی ہیں لیکن ہوم ممبر نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اظہار خیالات کی رو میں (اور جہاں تک اراکین حکومت کا تعلق ہے یہ رو بہت کم پیدا ہوتی ہے) ان[illegible] کچھ زیادہ معلومات پیش کر دیں جس کے متعلق مسٹر جناح نے ہرگز کچھ دریافت نہیں کیا تھا یعنی انہوں نے (ہوم ممبر نے) فرمایا کہ:-

"گورنمنٹ ہند ان ہی شرائط کے ساتھ یہی برتاؤ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی کرنے کو تیار ہے جو اس قانون کے تحت محض اپنی شورش انگیز طرز[illegible] پولیٹکل ایجی ٹیشن کی وجہ سے پابند کیے گئے ہیں۔"

ان الفاظ نے قدرتاً مسٹر جناح کا خیال ان دونوں بھائیوں کی طرف پھیر دیا[illegible] کے نام اس سلسلہ میں برابر آپ کے نام کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور انہوں نے ہوم م[illegible]

ان الفاظ کی تشریح کرانے کے لیے ایک ضمنی سوال کیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا گورنمنٹ علی اور شوکت کے معاملہ پر بھی غور کرے گی؟ اگر سر ولیم فوراً اس سوال کا جواب نہ دے سکتے تو ان کو چاہیے تھا کہ وہ اس سوال کا نوٹس مانگتے۔ لیکن اگر وہ جانتے (اور جیسا کہ انہیں اس وقت یقیناً معلوم ہوگا) کہ ان بھائیوں کا معاملہ کیا ہے، تو پھر اس ضمنی سوال کے سلسلہ میں ان کو جواب دینے کا موقع حاصل ہو گیا تھا۔

اگر نظر بندان چھندواڑہ کا معاملہ ۵ اور ۲۶ ستمبر کے درمیان دفعتاً بدل نہیں گیا تو اسی وقت سر ولیم وہ جواب دے سکتے تھے جو بعد کو اکتوبر اور نومبر میں دہرائے آپ کو دیا یعنی یہ کہ ان بھائیوں کا معاملہ آپ کے معاملہ سے مختلف ہے اور یہ کہ جو کاروائی آپ کے معاملہ میں کی گئی وہ ان کے معاملہ میں نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ ان کی نظر بندی کے وجوہ بالکل مختلف ہیں۔ مگر بجائے اس کے گورنمنٹ کی طرف سے اس ضمنی سوال کے جواب میں کہا گیا کہ:۔

"گورنمنٹ محمد علی اور شوکت علی کے معاملہ میں غور کر رہی ہے اور مزید استفسارات کئے جا رہے ہیں۔"

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا یہ جواب کسی سمجھ دار آدمی کو ان الفاظ کے سننے کے لیے تیار کر سکتا ہے، جو تین ہفتہ بعد کہے گئے؟ یعنی:۔

قانون تحفظ ہند کے تحت جو مسٹر محمد علی و شوکت علی پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، وہ صرف پولیٹیکل ایجیٹیشن کی شورش انگیز طریقوں کی وجہ سے عائد نہیں کی گئیں بلکہ ان کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ملک معظم کے دشمنوں کے ساتھ آزادانہ ہمدردی ظاہر کی اور لوگوں میں پیدا کرنی چاہی اور اس طرح امن عامہ کو خطرہ میں ڈالا۔ گورنمنٹ ہند نے ان اصحاب کے متعلق مزید تحقیقات کیں اور معلومات۔۔ وہ آزاد پر جو حاصل ہوتی ہیں پوری

اعتیاد کے ساتھ غور کرنے اور کاغذات کی جانچ دوبارہ کرنے کے بعد طے کیا ہے کہ وہ اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہو سکتی کہ ان نظر بندوں کے طرز عمل میں اس معاملہ میں (یعنی دشمنان سلطنت کے ساتھ ہمدردی) کوئی معتدبہ تبدیلی ہوئی ہے یا یہ کہ یہ پابندیاں بلا کسی اندیشہ کے منسوخ کی جا سکتی ہیں۔"

یہ پہلا موقع ہے کہ پبلک کو محمد علی اور شوکت علی صاحبان کے متعلق وہ وجوہ بتائے گئے جن کی بنا پر یہ اصحاب نظر بند کر دیے گئے تھے۔ اور یہی پہلا موقع تھا کہ معلومات اور "موصولہ" اور "پچھلے" کاغذات کا حوالہ دیا گیا۔ حالانکہ گذشتہ اجلاس کونسل میں سابق ہوم ممبر نے صاف کہا تھا کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا یا کر رہے ہیں وہ کھلم کھلا کیا اور اس لیے تحقیقات و جانچ کے لیے کسی غیر سرکاری کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ آیا یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ ۵ دسمبر سے ۲۶ دسمبر کا وقفہ جو صرف راجہ صاحب محمود آباد کو ہی نہیں سی آئی ڈی کے افسر کو جو سر چارلس کلیولینڈ کے ماتحت ہے۔ بدیں غرض دیا گیا کہ وہ چھندواڑہ میں نظر بند بھائیوں سے ملے، اور گورنمنٹ نے اپنے معیار عمل کو بدلنے پر اگر غور کیے جانے کے قابل کوئی معلومات تھیں اور پہلے کے کاغذات پر دوبارہ غور کیے جانے کی ضرورت تھی تو اس کا وقت مسٹر عبد المجید سی۔ آئی۔ ڈی افسر کے نظر بند جانوں کے پاس رہا کیے جانے کے شرائط پیش نظر کرنے سے قبل تھا۔

گورنمنٹ نے ذکر کیا ہے جس پر آپ کے خط کے مطابق جو آپ نے اخبارات میں شائع کرایا ہے اہم ترین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور جو رعایا کے حقوق اور ان کے مفاد کی حفاظت کرنے کی ضامن ہے۔ کوئی شخص بھی جس میں کاروبار کا معمولی سا مادہ ہو کچھ تجربہ رکھتا ہو اس وقت تک کوئی ایسی تجویز نہیں کر سکتا جو مسٹر عبد المجید نے اکر پیش کی جب تک کہ صورت معاملات پر ہر نوعیت سے غور نہ کر لیا گیا ہو اور اس نے

فیصلہ نہ کر دیا ہو کہ جو رعایتیں حاصل ہوئی ہیں ان کی کچھ پروا نہ کرے اور پرانے کاغذات
سے درگزر کرکے یہ فیصلہ نہ کر چکا ہو کہ یہ لوگ رہا کر دیے جائیں اگر وہ صرف ان شرائط کی
پابندی کرنے پر آمادہ ہوں جو اس تجویز (رہائی کی تجویز) کے ساتھ ان کے سامنے پیش کی
جائیں اور وہ اس کی ذمہ داری لے لیں۔ میں گورنمنٹ کے اس اعتراض کو پورے طور
پر سمجھتا ہوں جو گورنمنٹ کو اس اضافہ پر ہے، جو نظر بند برادران نے شرائط کی تحریک
پر کیا۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ کوئی حکومت جو اپنی رعایا کو پوری مذہبی
آزادی دیتی ہے۔ اس پر اعتراض نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا اس امر پر زور دے کہ وہ
"اپنے مذہبی اصول کے مطابق سب سے پہلے خدا کے احکام مانیں گے"۔ اور وہ صرف یہ
وعدہ کر سکتے ہیں کہ ان کو ان امور کے کرنے یا ان سے احتراز کرنے میں تامل نہ ہوگا۔
جو ان کے مذہبی احکام کے خلاف نہیں پڑتے۔ "وہ اپنے مذہبی فرائض کی انجام دہی میں
کسی قسم کی خفیف سی رکاوٹ کو بھی منظور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ کیا گورنمنٹ
چاہتی ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ گورنمنٹ نے اس پر اعتراض کیا ہے؟

کیا ان الفاظ کے اضافہ ہی کی وجہ سے گورنمنٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ان
لوگوں کے طرز عمل میں کوئی مادی تبدیلی نہیں ہوئی"؟

میں یہ سوالات اس وجہ سے کرتا ہوں کیونکہ ۱۴ ستمبر کو راجہ صاحب محمود آباد
سے صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہی امور تھے جنہوں نے ترقی میں رکاوٹ
پیدا کر دی۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہوم ممبر نے ۵ روز بعد جو جواب دیا اس میں اس کا بالکل
ذکر ہی نہیں ہے اور ایک شخص اگر وہ صرف اس جواب ہی کو مد نظر رکھے تو یہ خیال
کر سکتا ہے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا چھندواڑہ کا یہ سفر پرانے نظر بند
دوستوں کے پاس جانے کا ایک سفر تفریح تھا اور اس سفر کو ان کی رہائی کے معاملہ سے

احتیاط کے ساتھ غور کرنے اور کاغذات کی جانچ دوبارہ کرنے کے بعد طے کیا ہے کہ وہ اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہو سکتی کہ ان نظر بندوں کے طرزِ عمل میں اس معاملہ میں (یعنی دشمنانِ سلطنت کے ساتھ ہمدردی) کوئی معتدبہ تبدیلی ہوئی ہے یا یہ کہ یہ پابندیاں بلا کسی اندیشہ کے منسوخ کی جا سکتی ہیں۔"

یہ پہلا موقع ہے کہ پبلک کو محمد علی اور شوکت علی صاحبان کے متعلق وہ وجوہ بتائے گئے جن کی بنا پر یہ اصحاب نظر بند کر دیے گئے تھے۔ اور یہی پہلا موقع تھا کہ "معلومات اور ا[illegible] موصولہ" اور پچھلے کاغذات کا حوالہ دیا گیا۔ حالانکہ گذشتہ اجلاس کونسل میں سابق ہوم ممبر صاف کہا تھا کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا یا کر رہے ہیں وہ علم کھلا کیا اور اس لیے تحقیقات و جانچ کے لیے کسی غیر سرکاری کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ آیا یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ ۵ دسمبر سے ۲۶ دسمبر کا وقفہ جو صرف راجہ صاحب محمود آباد ہی نہیں سی آئی ڈی کے افسر کو جو سر چارلس کلیولینڈ کے ماتحت ہے۔ بدین غرض گیا کہ وہ چھندواڑہ میں نظر بند بھائیوں سے ملے؟ اور گورنمنٹ نے اپنے معیار عمل کو بلند اگر غور کیے جانے کے قابل کوئی معلومات ہیں اور پہلے کے کاغذات پر دوبارہ غور کیے جانے کی ضرورت تھی تو اس کا وقت مسٹر عبد المجید سی۔ آئی۔ ڈی افسر کے نظر بند جانوں کے پاس رہا کیے جانے کے شرائط پیش نظر کرنے سے قبل تھا۔

گورنمنٹ نے ذکر کیا ہے جس پر آپ کے خط کے مطابق جو آپ نے اخبارات میں شائع کرایا ہے اہم ترین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور جو رعایا کے حقوق اور ان کے مفاد کی حفاظت کرنے کی ضامن ہے۔ کوئی شخص بھی جس میں کاروبار کا معمولی سا مادہ ہو کچھ تجربہ رکھتا ہو اس وقت تک کوئی ایسی تجویز نہیں کر سکتا جو مسٹر عبد المجید نے اگر پیش کی جب تک کہ صورتِ معاملات پر ہر نوعیت سے غور نہ کر لیا گیا ہو اور اس نے

فیصلہ نہ کر دیا ہو کہ جو وائیں حاصل ہو ئی ہیں ان کی کچھ پروا نہ کرے اور پرانے کاغذات سے دوبارہ غور کر کے یہ فیصلہ نہ کر چکا ہو کہ یہ لوگ رہا کر دیے جائیں اگر وہ صرف ان شرائط کی پابندی کرنے پر آمادہ ہوں جو اس تجویز رہائی کی تجویز کے ساتھ ان کے سامنے پیش کی جائیں اور وہ اس کی ذمہ داری لے لیں۔ میں گورنمنٹ کے اس اعتراض کو پورے طور پر سمجھتا ہوں جو گورنمنٹ کو اس اضافہ پر ہے، جو نظر بند برادران نے شرائط کی تحریک پر کیا۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ کوئی حکومت جو اپنی رعایا کو پوری مذہبی آزادی دیتی ہے۔ اس پر اعتراض نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا اس امر پر زور دے کہ وہ اپنے مذہبی اصول کے مطابق سب سے پہلے خدا کے احکام مانیں گے۔" اور وہ صرف یہ وعدہ کر سکتے ہیں کہ ان کو ان امور کے کرنے یا ان سے احتراز کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ جان کے مذہبی احکام کے خلاف نہیں پڑتے۔" وہ اپنے مذہبی فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کی خفیف سی رکاوٹ کو بھی منظور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ کیا گورنمنٹ چاہتی ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ گورنمنٹ نے اس پر اعتراض کیا ہے؟

کیا ان الفاظ کے اضافہ ہی کی وجہ سے گورنمنٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ان لوگوں کے طرزِ عمل میں کوئی مادی تبدیلی نہیں ہوئی"؟

میں یہ سوالات اس وجہ سے کرتا ہوں کیونکہ ۱۱ ستمبر کو راجہ صاحب محمود آباد سے صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ہی امور تھے جنہوں نے ترقی میں رکاوٹ پیدا کر دی، مگر عجیب بات ہے کہ ہوم ممبر نے ۵ روز بعد جو جواب دیا اس میں اس کا بالکل ذکر ہی نہیں ہے اور ایک شخص اگر وہ صرف اس جواب ہی کو مدنظر رکھے تو یہ خیال کر سکتا ہے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی، آئی، ڈی کا چھندواڑہ کا یہ سفر پرانے نظر بند دوستوں کے پاس جانے کا ایک سفر تفریح تھا اور اس سفر کو ان کی رہائی کے معاملہ سے

کچھ بھی تعلق نہ تھا اور جس تحریر پر انہوں نے دستخط کیے تھے اور جو ان کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی، آئی، ڈی، اپنے محکمہ کے افسر اعلیٰ کو دینے کے لیے دیا تھا وہ اپنے دوست کی ذاتی تحریر کا دوستانہ جواب تھا۔ راجہ صاحب نے اپنے مذکورہ الفاظ میں صرف ایک چیز کی جس کو وہ چھپا نہ سکے۔ مگر ۲۰ ستمبر کو اور اس کے بعد سب سے بڑی بات جو ان بھائیوں کے رہا نہ کیے جانے کے متعلق نظر آتی ہے اور جس کا ذکر ہوم ممبر نے اپنے آخری جواب میں کیا ہے "سابق کاغذات" ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں، مگر وہ "خفیہ معلومات" جو باہر کے لوگوں کے سامنے نہیں رکھی جا سکتیں اور وہ باتیں جو بیان کی جا سکتیں اور پبلک میں نہیں لائی جا سکتیں آج پبلک پر روشن ہیں۔ گو وہ دونوں حضرات جو اس معاملہ سے بہت زیادہ تعلق رکھتے ہیں اپنے نزدیک انہیں خفیہ راز سمجھے ہوئے ہیں۔ آج کل خبریں بہت تیز رفتاری سے سفر کرتی ہیں اور ذیل میں وہ خبریں درج کی جاتی ہیں جو چند ڈیڑھ مہینے علیحدہ علیحدہ راستوں سے الگ مقام تک پہنچ گئیں۔

سب سے پہلے ۱۰ ستمبر کو راجہ صاحب محمود آباد کے ذریعہ سے نظر بند برادران کو معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کہتی ہے کہ اس کے پاس مجرمانہ قسم کے چند خطوط ہیں، جن کی نسبت گورنمنٹ کہتی ہے کہ وہ نظر بند برادران نے لکھے ہیں۔ باوجود اس کے راجہ صاحب کو یقین تھا کہ وہ آپ کے اور آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ۱۲ دسمبر کو رہا ہو جائیں گے قبل اس کے کہ دونوں بھائی ان خطوط کے جعلی ہونے کا پرزور دعویٰ کریں راجہ صاحب کو ان خطوط کے جعلی ہونے کا پورا یقین تھا۔ اس کے بعد مزید تفصیلات ان تک پہنچیں معلوم ہوا کہ کہا جاتا ہے کہ مسٹر شرکت علی نے فوج کے کسی رسالدار کو ایک خط لکھا میں فوج کو برطانیہ کی طرف سے نہ لڑنے پر ابھارنے کی تلقین کی گئی تھی۔ مگر اس کے متعلق سرسری افواہ ہے۔ اسی طرح دو اور خطوط گورنمنٹ ہند کو مجبور کرنے کا باعث ہوئے نے فیصلہ کیا کہ جن لوگوں پر ان خطوط کے تصنیف ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

ان دونوں خطوط میں سے ایک خط زبان فارسی میں مسٹر محمد علی کی طرف سے جرمجبٹی امیر کابل کے نام لکھا جاتا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ یہ زبان (فارسی) ایسی زبان ہے جس میں وہ خط نہیں لکھ سکتے نہ اس زبان میں انہوں نے کبھی کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس خط میں انہوں نے امیر صاحب کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی اور کہا جاتا ہے کہ یہ خط ہز مجسٹی امیر صاحب تک پہنچ گیا اور اسے امیر صاحب نے ایک خاص ہرکارے کے ہاتھ برطانوی گورنمنٹ کو بھیج دیا۔

دوسرا خط مسٹر شوکت علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے جو انہوں نے اپنے روحانی مشیر اور پیر فرنگی محل لکھنؤ کے مشہور مولوی کو لکھا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خط ۵ ستمبر سے ۱۳ ستمبر کے درمیان گورنمنٹ کے ہاتھوں پہنچا ہے اور اُسی زمانہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اُس کے خطوط سابقہ کاغذات کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ وہ خط ہے جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے نظر بند برادران کی رہائی میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کر دی یہ خط نہایت باغیانہ نوعیت رکھتا اور ان لوگوں نے جن کو اس تحریر کے اندر جو مسٹر عبدالمجید کو نظر بندوں نے دی تھی نہایت خوفناک معنی نظر آتے ہیں۔ اس خط کی نوعیت کو مفید سمجھا گیا کہ وہ اس تحریر کی تفصیل و تشریح تھی اور حسب مراد معنی لگانے میں آسانی ہو گئی۔ اگر اس خط کے ساتھ واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ برادران نہ صرف خود ہی پورے باغی ہیں۔ کہ وہ چاہتے ہیں کہ فوراً تمام مسلمان برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کریں۔ بظاہر یہ خط جعلی ہے کیونکہ اس وقت امیر صاحب کے نام کا جعلی خط افسوسناک نتائج برآمد کرنے میں ناکام رہا تھا۔ تاہم موسم گرما کے پہلے ہفتے کے بعد نظر بند برادران کے بعد ان کے ساتھ رہا کیے جانے کی عالمگیر امیدیں قائم ہو گئی تھیں۔ خیال یہ ہے کہ خط رہائی روکنے کے لیے وضع کیا گیا تھا اور اس خط کی بابت جو کچھ میں معلوم ہوا ہے اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اس خط میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی گئی تھی کہ رہائی کا موقع یاد رہتا ہو گا
نوعیت ہی سے اس کے جعلی ہونے کا پتہ چلتا ہے اور اگر یہ خط ہی ڈھائی برس بعد لیڈروں
لیڈروں کے رہا کیے جانے میں رکاوٹ پیدا کرنے والا تھا تو اس پر کامل غور و خوض کیا
جانا چاہیے تھا اور اگر یہ لوگ اس قدر غیر معمولی قوت اور قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی
آزادی سے برطانوی اور اتحادی فتح میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے تو کم از کم ان کو
کو معمولی عقل والا انسان تو ضرور خیال کرنا چاہیے۔

مگر کیا یہ قابلِ یقین نہیں ہے کہ اس حالت میں جبکہ ان کی رہائی کا بہت زیادہ
امکان تھا وہ اس قسم کے حماقت خیز طرزِ عمل سے اپنی اپنی آزادی میں رکاوٹ پیدا
کرانے کے موجب ہو سکیں گے اور ایک ایسے شخص کو ایسی حالت میں خط لکھ کر ڈاک
خانے کے سپرد کر دیں گے جس نے ان کے علم میں ایک موقع پر خود شکایت کی تھی کہ علاوہ
ہوتا ہے راستے ہی میں میرے خطوط کھولے جاتے ہیں اور یہ کہ خطوط کو لینے سے انکار کر
تھا، باوجودیکہ ان کا ایک خط بھی ہے جس میں انتہائی وفاداری کے جذبات ہیں ان کے
لیے اس حالت میں ضرور برے نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس کے سنسر کو دکھائے
بغیر بھیج دیں جبکہ وہ اپنی نظربندی کے احکام کے مطابق اپنے خطوط سنسر کو دکھانے
بعد بھیجنے پر مجبور رہیں۔

جس دن ان حضرات کو ان خطوط کے متعلق علم ہوا انہوں نے آنریبل راجہ صاحب
محمود آباد، آنریبل مسٹر جناح اور آنریبل مسٹر مظہر الحق کو تار دیے جس میں ان خطوط سے
تعلق ہونے سے پرزور انکار کیا اور ان کے ذریعے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ
گورنمنٹ ان خطوط کو دکھائے جن کا اس کے قبضہ میں ہونا بیان کیا جاتا ہے۔
ان تاروں کو لوکل گورنمنٹ کو بھیج دیا پھر انہیں ہوم سکریٹری گورنمنٹ ہند کو دیا
گیا چونکہ اس درخواست کا کوئی جواب نہ ملا اس پر مسٹر محمد علی نے سر جیمس مسٹن

کو ایک خط لکھا جو ذاتی طور پر مسٹر محمد علی کو جانتے تھے اور جنہوں نے سر ولیم ونسنٹ سے ہوم ممبری کا چارج لیا تھا۔ اس میں انہوں نے کسی ایسی مجرمانہ تحریر سے اپنے اور اپنے بھائی کے تعلق سے انکار کیا اور درخواست کی پھر دہرایا کہ وہ خطوط ان کو دکھلائے جائیں۔ انہوں نے سر جیمس کو یہ بھی لکھا کہ آیا آپ کے خیال میں ہم دونوں ایسے آدمی نہیں ہیں جو ایسے خوفناک خیالات رکھ کر وعدہ کریں اور تحریر دیں۔ اور یہ بھی کہا کہ بہت کینہ اور کمزور ترین دماغ کے آدمی کے سوا کوئی شخص ایسے خوفناک خیالات کو دل میں چھپا کر تحریر نہیں دے سکتا۔ اس کے جواب میں یہاں کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا اور انہوں نے دونوں بھائیوں کو اطلاع دی کہ یہ خط کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

مگر یہ نہیں معلوم کہ وائسرائے سے ملاقات سے قبل یہ خط کونسل کے سامنے پیش کیا جا چکا یا نہیں تو نہیں ہے اور اگر پیش ہوا تو یہاں اس کا علم نہیں ہے کہ سابقہ کاغذات کے متعلق کونسل نے کیا خیالات قائم کیے۔ آپ نے اخبارات میں جو بیان شائع کرایا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے جو ہم یہاں سن چکے ہیں کہ گورنمنٹ نے پھر اپنے قاعدہ میں تبدیلی کر دی ہے اور سابقہ کاغذات کو حق کر جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ گورنمنٹ خود مصنوعی خیال کی شکل میں رجوع ہے، وہ خبریں ایسی جو ان برادران کی رہائی میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہوں بلکہ اپنی مدد کی بنا ہی اور اس کی وجہ سے جو مخبروں اور ترکوں کی جو ہمت افزائی ہوئی ہے وہ اصل چیز ہے جو اس وقت ان کی رہائی میں حارج ہے قدرتی طور پر اس کا جواب یہ دینا پڑتا ہے کہ کچھ منصفانہ طرز عمل نہیں ہے کہ روسی یکسی طرح کی اور بالشویسٹوں کے خلاف جو غصہ ہے اس کو چند وارڈ کے نظر بندوں پر اتارا جائے۔ ان کی رہائی یا نظر بندی کا انحصار ان امور پر اٹھا رکھا جائے جو بظاہر ان کے قبضہ اور اقتدار سے باہر ہیں لیکن واقعی اگر صورت معاملات پر غور کرنے کی یہی قابل اطمینان حالت ہے

ہوتا ہے کہ اس خط میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی گئی تھی (کہ رہائی کا موقع یاد رہتا انکی
نوعیت ہی سے اس کے جعلی ہونے کا پتہ چلتا ہے اور اگر یہ خط ہی ڈھائی برس بعد لیڈ
لیڈروں کے رہا کیے جانے میں رکاوٹ پیدا کرنے والا تھا تو اس پر کوئی غور نہ کیا
جانا چاہیے تھا اور اگر یہ لوگ اس قدر غیر معمولی قوت اور قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی
آزادی سے برطانوی اور اتحادی فتح میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے تو کم از کم ان کو
کو معمولی عقل والا انسان تو ضرور خیال کرنا چاہیے۔

مگر کیا یہ قابل یقین نہیں ہے کہ اس حالت میں جبکہ ان کی رہائی کا بہت زیادہ
امکان تھا وہ اس قسم کے حماقت خیز طرز عمل سے اپنی اپنی آزادی میں رکاوٹ پیدا
کرانے کے موجب ہو سکیں گے اور ایک ایسے شخص کو ایسی حالت میں خط لکھ کر اسے ڈاک
خانے کے سپرد کر دیں گے جس نے ان کے علم میں ایک موقع پر خود شکایت کی تھی کہ معلوم
ہوتا ہے راستہ ہی میں میرے خطوط کھولے جاتے ہیں اور یہ کہہ کر خطوط کو لینے سے انکار کر دیا
تھا، باوجودیکہ ان کا ایک خط بھی ہے جس میں انتہائی وفاداری کے جذبات ہیں ان کے
لیے اس حالت میں ضرور بُرے نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس کے سنسر کے دکھائے
بغیر بھیج دیں جبکہ وہ اپنی نظر بندی کے احکام کے مطابق اپنے خطوط سنسر کو دکھانے
بعد بھیجنے پر مجبور ہیں۔

جس دن ان حضرات کو ان خطوط کے متعلق علم ہوا، انہوں نے آنریبل راجہ صاحب
محمود آباد، آنریبل مسٹر جناح اور آنریبل مسٹر مظہر الحق کو تار دیے جن میں ان خطوط سے
تعلق ہونے سے پُرزور انکار کیا اور ان کے ذریعہ سے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ
گورنمنٹ ان خطوط کو دکھائے جن کا اس کے قبضہ میں ہونا بیان کیا جاتا ہے۔
ان تاروں کو لوکل گورنمنٹ کو بھیج دیا پھر انہیں ہوم سکریٹری گورنمنٹ ہند کو بھیج
گیا۔ چونکہ اس درخواست کا کوئی جواب نہ ملا اس پر مسٹر محمد علی نے سر جیمس مسٹن

کو ایک خط لکھا جو ذاتی طور پر مسٹر محمد علی کو جانتے تھے اور جنہوں نے سر ولیم ونسنٹ سے جرم مجری کا چارج لیا تھا۔ اس میں انہوں نے کسی ایسی مجرمانہ تحریر سے اپنے اور اپنے بھائی کے تعلق سے انکار کیا اور درخواست کی پھر دہرایا کہ وہ خطوط ان کو دکھلائے جائیں۔ انہوں نے سر جیمس کو یہ بھی لکھا کہ آیا آپ کے خیال میں ہم لوگ ایسے آدمی نہیں ہیں جو ایسے خوفناک خیالات رکھ کر وعدہ کریں اور تحریر دیں۔ اور یہ بھی کہا کہ بہت کمینہ اور کمزور ترین دماغ کے آدمی کے سوا کوئی شخص ایسے خوفناک خیالات کو دل میں چھپا کر تحریر نہیں دے سکتا۔ اس کے جواب میں یہاں کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا اور انہوں نے دونوں بھائیوں کو اطلاع دی کہ یہ خط کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

مگر یہ نہیں معلوم کہ وائسرائے سے ملاقات سے قبل یہ خط کونسل کے سامنے پیش کیا گیا یا نہیں۔ قیاس تو نہیں ہے اور اگر پیش ہوا تو یہاں اس کا علم نہیں ہے کہ سابقہ کاغذات کے متعلق کونسل نے کیا خیالات قائم کیے۔ آپ نے اخبارات میں جو بیان شائع کرایا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے جو ہم یہاں سن چکے ہیں کہ گورنمنٹ نے پھر اپنے مقاصد میں تبدیلی کر دی ہے اور سابقہ کاغذات کو جن کو جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ گورنمنٹ خود مصنوعی خیال کر سکی جو فیصلہ ترجیح ہے، وہ خبریں آئیں جو ان برادران کی رہائی میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہیں بلکہ اپنی مدد کی بنا بھی اور اس کی وجہ سے جو منصوبی اور ترکوں کی جو ہمت افزائی ہوئی ہے وہ اصل چیز ہے جو اس وقت ان کی رہائی میں حارج ہے قدرتی طور پر اس کا جواب یہ دینا پڑتا ہے کہ کچھ مضائقہ نہ طرز عمل نہیں ہے کہ روسی یکسی ترکی اور بالشویسٹوں کے خلاف جو غصہ ہے اس کو ہند وارڈ کے نظر بندوں پر اتارا جائے۔ ان کی رہائی یا نظر بندی کا انحصار ان امور پر اظہار رکھا جانے جو بظاہر ان کے قبضہ اور اقتدار سے باہر ہیں لیکن واقعی اگر صورت معاملات پر غور کرنے کی یہی قابل اطمینان حالت ہے

ہوتا ہے کہ اس خط میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی گئی تھی اگر رہائی کا موقع یاد رہتا ہوگی [illegible] نوعیت ہی سے اس کے جعلی ہونے کا پتہ چلتا ہے اور اگر یہ خط ہی ڈھائی برس بعد لیڈر [illegible] لیڈروں کے رہا کیے جانے میں رکاوٹ پیدا کرنے والا تھا تو اس پر کوئی غور ہو گیا [illegible] جانا چاہیے تھا اور اگر یہ لوگ اس قدر غیر معمولی قوت اور قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی آزادی سے برطانوی اور اتحادی فتح میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے تو کم از کم ان [illegible] کو معمولی عقل والا انسان تو ضرور خیال کرنا چاہیے۔

مگر کیا یہ قابل یقین نہیں ہے کہ اس حالت میں جبکہ ان کی رہائی کا بہت زیادہ [illegible] امکان تھا وہ اس قسم کے حماقت خیز طرز عمل سے اپنی اپنی آزادی میں رکاوٹ پیدا کرانے کے موجب ہو سکیں گے اور ایک ایسے شخص کو ایسی حالت میں خط لکھ کر اسے ڈاک خانے کے سپرد کر دیں گے جس نے ان کے علم میں ایک موقع پر خود شکایت کی تھی کہ معلوم ہوتا ہے راستہ ہی میں میرے خطوط کھولے جاتے ہیں اور یہ کہہ کر خطوط کو لینے سے انکار کر [illegible] تھا، باوجودیکہ ان کا ایک خط بھی ہے جس میں انتہائی وفاداری کے جذبات ہوں اس [illegible] لیے اس حالت میں ضرور بُرے نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس کے سنسر کے دکھائے [illegible] بغیر بھیج دیں جبکہ وہ اپنی نظربندی کے احکام کے مطابق اپنے خطوط سنسر کو دکھا کر [illegible] بھیجنے پر مجبور ہیں۔

جس دن ان حضرات کو ان خطوط کے متعلق علم ہوا انہوں نے آنریبل راجہ صاحب [illegible] محمود آباد، آنریبل مسٹر جناح اور آنریبل مسٹر مظہر الحق کو تار دیے جن میں ان خطوط سے [illegible] تعلق ہونے سے پُرزور انکار کیا اور ان کے ذریعے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ [illegible] گورنمنٹ ان خطوط کو دکھائے جن کا اس کے قبضہ میں ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ [illegible] ان تاروں کو لوکل گورنمنٹ کو بھیج دیا پھر انہیں ہوم سکریٹری گورنمنٹ ہند کو بھیج [illegible] گیا چونکہ اس درخواست کا کوئی جواب نہ ملا اس پر مسٹر محمد علی نے سر جیمس مسٹن [illegible]

کو ایک خط لکھا جو ذاتی طور پر مسٹر محمد علی کو جانتے تھے اور جنہوں نے سر ولیم ونسنٹ سے ہوم ممبری کا چارج لیا تھا۔ اس میں انہوں نے کسی ایسی مجرمانہ تحریر سے اپنے اور اپنے بھائی کے تعلق سے انکار کیا اور درخواست کی پھر دہرایا کہ وہ خطوط ان کو دکھلائے جائیں۔ انہوں نے سر جیمس کو یہ بھی لکھا کہ آیا آپ کے خیال میں ہم ڈرگ ایسے آدمی نہیں ہیں جو ایسے خوفناک خیالات رکھ کر وعدہ کریں اور تحریر دیں۔ اور یہ بھی کہا کہ بہت کمینہ اور کمزور ترین دماغ کے آدمی کے سوا کوئی شخص ایسے خوفناک خیالات کو دل میں چھپا کر تحریر نہیں دے سکتا۔ اس کے جواب میں یہاں کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا اور انہوں نے دونوں بھائیوں کو اطلاع دی کہ یہ خط کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

کہ یہ نہیں معلوم کہ وہ افسر سے ملاقات سے قبل یہ خط کونسل کے سامنے پیش کیا جا چکا یقینی تو نہیں ہے اور اگر پیش ہوا تو یہاں اس کا علم نہیں ہے کہ سابقہ کاغذات کے متعلق کونسل نے کیا خیالات قائم کیے۔ آپ نے اخبارات میں جو بیان شائع کرایا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے جو ہم یہاں سن چکے ہیں کہ گورنمنٹ نے چھاپنے قاعدہ میں تبدیلی کر دی ہے اور سابقہ کاغذات کو جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ گورنمنٹ خود مصنوعی خیالی کرسکی طرف رجوع ہے، وہ خبریں ایسی جو ان برادران کی رہائی میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہوں بلکہ اپنی مدد کی بنا ہی اور اس کی وجہ سے جو منتوں اور تذکروں کی جو ہمت افزائی ہوئی ہے وہ اصل چیز ہے جو اس وقت ان کی رہائی میں حارج ہے قدرتی طور پر اس کا جواب یہ دینا پڑتا ہے کہ کچھ منصفانہ طرزِ عمل نہیں ہے کہ روسی یکسی طرح کی اور بالشویزم کے خلاف جو خطرہ ہے اس کو بھنڈ وارڈ کے نظر بندوں پر اتارا جائے۔ ان کی رہائی یا نظر بندی کا انحصار ان امور پر انحصار کھا جانے جو بظاہر ان کے قبضہ اور اقتدار سے باہر ہیں لیکن واقعی اگر صورتِ معاملات پر غور کرنے کی یہی قابلِ اطمینان حالت ہے

تو یقیناً ان نظر بند برادران کی حالت آپ کی اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے کی ملاقات کے
بعد اور بھی مخدوش ہو گئی ہے کیونکہ اس کے فوراً بعد ہی اٹلی کی تباہی کی خبریں اس ملک
میں آئی ہیں۔

مگر مجھے اندیشہ ہے کہ شاید ہی کوئی شخص ان دلائل پر سنجیدگی سے غور کرتا
ہے، گورنمنٹ اپنے موجودہ طرز عمل کی کوئی وجہ بھی کیوں نہ قرار دے۔ کم از کم وہ ایسی ہو
چاہیے کہ نظر بند برادران سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہو۔ کسی شخص کو منصفانہ طور پر
ان امور کی سزا نہیں دی جا سکتی جو اس کے قبضہ و اقتدار سے باہر ہوں اور خصوصیت کے
ساتھ وہ لوگ جن کی آزادیاں موجودہ تعزیری اقتدار کے ماتحت ضبط کی گئی ہوں۔ ان کی
تکالیف میں صرف یہ کہہ دینے سے کوئی کمی نہیں ـــــ کہ یہ کارروائی محض حفاظت
کیلئے ہے مگر تعزیری نہیں ہے اس لیے کہ اس زمانہ میں تحفظ اور تعزیر کے درمیان وا
قائم کرنی بہت مشکل۔ بہر حالت میں آزادی کا جاتا رہنا ناقابل برداشت ہے اگر
کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم کرتی ہے۔ تو اسے ان امور کے لیے آزادی سے
محروم کرنا چاہیے، جو وہ خود کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ نہ کہ اس کے لیے جو غیر ممالک میں ہو
ہے اور جہاں کے ہزاروں باشندے اپنے ملک میں کوئی کام کرتے ہیں یا نہیں کرتے

قبل اس کے کہ میں اس خط کو ختم کروں جس کی نسبت میں شرمندہ ہوں کہ اس
قسم کے خطوط کے حدود سے تجاوز کیا گیا ہے۔ میں گورنمنٹ سے یہ تجاوز کرنا چاہتا
کہ گورنمنٹ کو ان ذرائع کے متعلق کیا کہنا ہے کہ ان حضرات نے اپنی نظر بندی سے قبل اور خو
ے کام میں ملک معظم کے دشمنوں سے آزادانہ ہمدردی ظاہر کی اور اس کو وسعت
انہوں نے اپنی نظر بندی سے قبل کونسی تقریریں کیں یا ورکوں سے مضامین
لکھے جن میں اس ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور اس کو وسعت دی گئی اور اس وقت
قسم کے اظہار اور توسیع کی کیا شہادتیں موجود ہیں۔ جبکہ وہ نظر بند ہیں، اشاعت کے

یہ گورنمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی مضمون نہیں لکھ سکتے، نہ سیاسی حلقوں میں شریک ہو سکتے ہیں اور وہاں تقریر کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مجھے میرے ایک دوست نے جو اس زمانہ میں شملہ میں تھے جبکہ ان لوگوں کی رہائی کا مسئلہ درپیش تھا، مجھ سے کہا کہ یہ سوال واقعی کیا گیا اور اس کے جواب میں آزادانہ اظہارِ ہمدردی کے متعلق جو کچھ وہ سن سکے — وہ یہ تھا کہ جب ۲ برس ہوئے یہ لوگ لینسڈاون سے چھندواڑہ تبدیل ہو رہے تھے۔ اُس وقت انہوں نے الہ آباد کے اسٹیشن پر پلیٹ فارم پر سے ایک شخص سے جو اوپر پل پر تھا زور سے ایسی باتیں کیں جو انتہائی باغیانہ تھیں۔

فرض کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت ہوا جبکہ وہ یورپین اور پولس گارد کی معیت میں سفر کر رہے تھے، جس وقت حفظ ماتقدم کے طور پر الہ آباد کے سارے پلیٹ فارم کو خالی کر دیا گیا تھا اور ڈیڑھ سو سپاہی جس میں یورپین انسپکٹر اور ڈسٹرکٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ بھی شامل تھے اور اس کے علاوہ کلکٹر و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اپنی موجودگی ضروری خیال کی تھی، وہ لوگ جو اس قدر بداحتیاط ہوں کہ ایسے مشتاق گواہوں کی موجودگی میں جو ہر سرگوشی پر بھی کان لگائے ہوئے ہوں۔ ایسے موقع پر باغیانہ نعرہ لگا سکتے ہوں وہ سوائے اپنی ذات کے لیے مخدوش ہونے کے کسی دوسرے کے لیے مخدوش نہیں ہو سکتے اور ان کے متعلق بہترین تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں اس قدر اعتماد کے ساتھ ایسے طور پر آزاد کر دیا جائے کہ وہ عنقریب ملک کے وسیع قانون جرائم کے ماتحت عام قید خانہ میں پہنچ جائیں گے۔

ان خادمانِ قوم کی نظربندی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ معقول شہادت ہونی چاہیے کیونکہ ان کی عزت صرف ان کی ہی قوم میں نہیں ہے بلکہ ہندستان کی دیگر اقوام نے بھی ان کو وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھنے کا سبق حاصل کر لیا ہے۔ ایسی شہادت پر ایک جرائم کے عادی مجرم کو باقاعدہ بنائی ہوئی عدالت میں سزا نہیں دی

تو یقیناً ان نظر بند برادران کی حالت آپ کی اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے کی ملاقات کے
بعد اور بھی مخدوش ہو گئی ہے کیونکہ اس کے فوراً بعد ہی اٹلی کی تباہی کی خبریں اس ملک
میں آئی ہیں۔

مگر مجھے اندیشہ ہے کہ شاید ہی کوئی شخص ان دلائل پر سنجیدگی سے غور کرے
ہے، گورنمنٹ اپنے موجودہ طرز عمل کی کوئی وجہ بھی کیوں نہ قرار دے۔ کم از کم وہ ایسی
چاہیے کہ نظر بند برادران سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہو۔ کسی شخص کو منصفانہ طور
ان امور کی سزا نہیں دی جا سکتی جو اس کے قبضہ و اقتدار سے باہر ہوں اور خصوصیت کے
ساتھ وہ لوگ جن کی آزادیاں موجودہ تعزیری اقتدار کے ماتحت ضبط کی گئی ہوں۔ ان کی
تکالیف میں صرف یہ کہہ دینے سے کوئی کمی نہیں —— کہ یہ کارروائی محض حفاظتی
کیلئے ہے مگر تعزیری نہیں ہے اس لیے کہ اس زمانہ میں تحفظ اور تعزیر کے درمیان واضح
قائم کرنی بہت مشکل۔ بہرحالت میں آزادی کا جاتا رہنا ناقابل برداشت ہے اگر
کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم کرتی ہے۔ تو ایسے ان امور کے لیے آزادی سے
محروم کرنا چاہیے، جو وہ خود کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ نہ کہ اس کے لیے جو غیر ممالک میں
ہے اور جہاں کے ہزاروں باشندے اپنے ملک میں کوئی کام کرتے ہیں یا نہیں کرتے

قبل اس کے کہ میں اس خط کو ختم کردوں جس کی نسبت میں شرمندہ ہوں کہ اس
قسم کے خطوط کے حدود سے تجاوز کیا گیا ہے۔ میں گورنمنٹ سے یہ تجاوز کرنا چاہتا
کہ گورنمنٹ کو ان ذرائع کے متعلق کیا کہنا ہے کہ ان حضرات نے اپنی نظر بندی کا سے قبل اور
کے کام میں ملک معظم کے دشمنوں سے آزادانہ ہمدردی ظاہر کی اور اس کو وسعت
انہوں نے اپنی نظر بندی سے قبل کونسی تقریریں کیں یا اور کون سے مضامین
لکھے جن میں اس ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور اس کو وسعت دی گئی اور اس وقت
قسم کے اظہار اور توسیع کی کیا شہادتیں موجود ہیں۔ جبکہ وہ نظر بند ہیں۔ اشاعت کے

یہ گورنمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی مضمون نہیں لکھ سکتے، نہ سیاسی حلقوں میں شریک ہو سکتے ہیں اور وہاں تقریر کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مجھے میرے ایک دوست نے جو اس زمانہ میں شملہ میں تھے جبکہ ان لوگوں کی رہائی کا مسئلہ درپیش تھا، مجھ سے کہا کہ یہ سوال واقعی کیا گیا اور اس کے جواب میں آزادانہ اظہارِ ہمدردی کے متعلق جو کچھ وہ سن سکے — وہ یہ تھا کہ جب ۲ برس ہوئے یہ لوگ لینسڈون سے چھندواڑہ تبدیل ہو رہے تھے۔ اُس وقت انہوں نے الہ آباد کے اسٹیشن پر پلیٹ فارم پر سے ایک شخص سے جو اوپر پل پر تھا زور سے ایسی باتیں کہیں جو انتہائی باغیانہ تھیں۔

فرض کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت ہوا جبکہ وہ یورپین اور پولیس گارڈ کی معیت میں سفر کر رہے تھے، جس وقت حفظ ماتقدم کے طور پر الہ آباد کے سارے پلیٹ فارم کو خالی کر دیا گیا تھا اور ڈیڑھ سو سپاہی جس میں یورپین انسپکٹر اور ڈسٹرکٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ بھی شامل تھے اور اس کے علاوہ کلکٹر و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اپنی موجودگی ضروری خیال کی تھی، وہ لوگ جو اس قدر بد احتیاط ہوں کہ ایسے مشتاق گواہوں کی موجودگی میں جو ہر سرگوشی پر بھی کان لگائے ہوئے ہوں۔ ایسے موقع پر باغیانہ نعرہ لگا سکتے ہوں وہ سوائے اپنی ذات کے لیے مخدوش ہونے کے کسی دوسرے کے لیے مخدوش نہیں ہو سکتے اور ان کے متعلق بہترین تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں اس قومی اعتماد کے ساتھ پورے طور پر آزاد کر دیا جائے کہ وہ عنقریب ملک کے وسیع قانون جرائم کے ماتحت عام قید خانہ میں پہنچ جائیں گے۔

ان نادان قوم کی نظربندی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ معقول شہادت ہونی چاہیے کیونکہ ان کی عزت صرف ان کی ہی قوم میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام نے بھی ان کو وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھنے کا سبق حاصل کر لیا ہے۔ ایسی شہادت پر ایک جرائم کے عادی مجرم کو باقاعدہ بنائی ہوئی عدالت میں سزا نہیں دی

ہے کہ اس میں کچھ حرکت ہے ۔ کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے ؟ میں اس تحریر کو
طوالت پر معافی کا خواستگار ہو کر اس خط کو ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس
مراسلت سے نظربندان بھنڈو ائرہ کے معاملہ کو سمجھنے میں آپ کو سہولت ہوگی۔

آپ کا صادق
او، بی، گھاٹی

مسزاوما نہرو کے نام اُمّ الاحرار کا خط

مسلمانوں کی تاریخ سیاست کا ایک زریں ورق

مسز شرکت علی محمد علی کی قابل فخر والدہ ماجدہ نے مسز اوما نہرو الٰہ آباد کے نام ایک خط خواتین ہند کے وفد میں اپنی عدم شرکت کے متعلق لکھا تھا۔ وہ خط اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ آپ خواتین ہند کے وفد کی رکن منتخب کی گئی تھیں جو صاحب وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والا تھا آپ نے سب سے پہلے تحریر فرمایا ہے کہ میں اپنے دماغ اور اپنی صحت کی موجودہ حالت کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے اتنا طویل سفر برداشت کرنے کے ناقابل ہوں جبکہ مجھے اس ماہ میں ایک اور طویل سفر کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ تحریر فرماتی ہیں:

اس کے علاوہ چند اور امور ہیں جن کو میں نہایت آزادی اور جسارت کے ساتھ آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میری تحریر کا مطلب غلط نہ سمجھا جائے گا۔ خارج کے لوگ جو ہمارے ملک کو مشکل ہی سے دنیا کا کوئی ملک خیال کرتے ہوں گے۔ ہندوستان کی مصیبت زدہ پردہ دار عورتوں کے متعلق کچھ بھی خیال کیوں نہ کریں۔ مگر آپ جانتی ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ ہم لوگ اپنی چھوٹی سی حکومت میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ عورتیں اپنے گھروں کی ملکہ ہوتی ہیں اور ہمیں اپنے گھروں میں کسی قدر وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ اس کے

حصول کے لیے نئے طریقے اختیار کریں اور یہ بھی قابل اجازت ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا پرچار کریں کہ غیروں کے سامنے بھی جائیں خواہ ہم اپنے مقصد کی کامیابی کے متعلق کتنے ہی مشتبہ کیوں نہ ہوں۔

مگر کیا میں آپ سے دریافت کر سکتی ہوں کہ آیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم اپنی محدود چار دیواری کے اثرات ڈال کر اپنے بیٹیوں، بھائیوں یا باپوں سے مطالبہ کرتے بجائے اس کے کہ ہم بھکاری کے طور پر کسی دوسرے کے پاس جائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس معاملہ میں میری رائے نہایت سخت ہے اور آپ کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ یہ ایک ایسی عورت کی رائے ہے جو پرانے زمانہ کی ہندوستانی عورت ہے مگر وہ اپنے آپ کو نئے خیالات سے بھی بہرہ ور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔"

اس کے بعد آپ اپنے خط میں لکھتی ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی وفد پرانے ایام میں کسی ہندو یا مسلمان بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتا تو کیا ہوتا۔؟

"اگر اس وفد کا سا کوئی وفد پرانے ایام میں کسی ہندو یا مسلمان بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتا تو اُسے مطابق باپ؟ ہندی وہ فرماد حاصل ہو جاتا جس کا وہ طالب ہوتا خواہ اُس کے عطیہ سے مردوں کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچتا۔ اس کے علاوہ بادشاہ خیال کرتا کہ اس طرح اس کی غیر معمولی عزت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کے لوگ گاتے اور لوگ اس یادگار کو یادگار بنا دیتے۔ آپ کے وفد کے نتیجہ کی نسبت میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ مگر ہماری بھاری مہربان مسز بیسنٹ کے ساتھ ان کی اس کوشش اور ہمدردی کی وجہ سے جو انہوں نے سلطنت برطانیہ کو دوام بخشنے کے متعلق کی ہے جو کچھ زمانہ ہوا اس کو پیش نظر رکھ کر میں کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتی ہوں کہ ہمارا اینگلو انڈین پریس کی طرف سے آپ لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔"

کاش ہندوستانی عورتوں کی عزت کی خاطر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مردوں کی عزت

کی خاطر کوئی ایسا وفد صاحب وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے نہ جاتا بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے پاس جاتا اور نہایت صفائی سے اعلان کر دیتا کہ ہندوستان کی عورتیں اپنے مردوں سے کیا چاہتی ہیں مجھے یقین کامل ہے کہ عورتیں جو کچھ طلب کرتیں مرد جلد یا بدیر ان کے مطالبات پورے کر دیتے۔ یہ تمام دنیا کی تاریخ کا ایک سبق ہے یہی آخری وجہ جو آپ اپنے مدراس کے وفد میں شریک نہ ہونے کے متعلق پیش کرتی ہیں وہ ذاتی ہے۔ امید ہے کہ اینگلو انڈین حضرات، اور مسٹر ہائنگو اس کی پورے طور پر قدر کریں گے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ایک اور بات ہے کہ میں کس وجہ سے مدراس میں آپ لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہو سکوں گی اور یہ وجہ میری ذاتی ہے۔ صاحب وزیر ہند ایک آزاد ملک سے آئے ہیں اور آزاد آدمی کی حیثیت سے وہ چاہتے کہ وہ ایسے لوگوں سے ملیں اور گفت و شنید کریں جن کی حیثیت یہ ہو کہ وہ انہیں بتائیں کہ ہمارے ملک کی ضروریات کیا ہیں اور ہم اپنے ملک کی بہبودی و خوشنودی اس کو حاصل کرنے کے لیے کیا چاہتے ہیں۔ اگر طاقت اور انگریزی ملازمین سرکار جو تحقیقات سے نتائج وہ ان کے کمال ملک کے ہاتھوں کی جانب سے یا کسی ہندوستانی کے ہاتھوں سوائے کچھ کرنے کے کا حاصل نہیں کرتے۔ یہ مناسب خیال کرتے ہیں کہ جس وقت کہ صاحب وزیر ہند اس ملک میں ہیں ہم نوکروں کی طرح پردہ نشین رہیں اور لوگوں سے نہ ملیں جو نہایت آزادی کے ساتھ صورت حالات کو ان کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہیں۔ ان لوگوں میں میرے فرزند بھی شامل ہیں اور جن کو ملنے کی اجازت دیے جانے سے گورنمنٹ ہند نے انکار کر دیا۔

نہایت تعجب خیز امر ہو گا کہ صاحب وزیر ہند آپ کی رگ میں پیتے ہیں ایک آزاد ملک میں پرورش و نشو و نما پانے کی وجہ سے آزادی کی روح ہے۔ ان کو تو مشرقی ملک کی آب و ہوا میں رہنے کے قابل بنانے کے لیے پردہ میں رکھا جائے اور میں جو

پردہ نشینی عورتوں کی طرح پلی ہوں، پردہ سے نکل کھڑی ہوں۔ اگر میں رسم ورواج کو
چھوڑ کر اور وفد میں شریک ہونے کی تیار بھی ہو جاؤں تو یہ ممکن ہے کہ اسی دوران میں
صاحب وزیر ہند پر کچھ اور پالیسی پابندیاں عاید کر دی جائیں کہ میں ان سے اہم معاملات
مثلاً مذہبی عزت و احترام ہندوستانی عورتوں اور مردوں کی زندگیوں اور آزادی کے
متعلق کچھ نہ کہہ سکوں۔ میں ان سب باتوں کو ایک ایسی لازوال قوت کے سامنے
پیش کرنے کے لیے اٹھائے رکھتی ہوں جس کی ذات کسی التجا کرنے والے کرنا ہی کے
سے بہت اعلیٰ ہے اور جو خود لوگوں کو التجائیں پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ ان
پورا کیا جائے ۔

ام الاحرار کا پیام
مسلمانانِ ہند کے نام
جو
۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں پڑھا گیا

فرزندانِ اسلام، میرے عزیزو اور بچو!

آج کے دن میں تمہاری مجلس میں پہلی مرتبہ اور شاید آخری دفعہ (اس لیے کہ اب عمر کی آخری منزل آ لگی ہے) آئی ہوں۔ میری زندگی میں اس قدر عجیب نہیں جس قدر کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی عجیب اور معنی خیز ہے۔ جس محبت اور جوش کے ساتھ تم نے میرا خیر مقدم کیا اس کا اجر سوائے خدائے کریم کے کوئی نہیں دے سکتا لیکن تم نے اپنی محبت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا ہے جو انشاء اللہ تا دمِ مرگ میرے صفحۂ دل سے محو نہ ہوگا۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ جوش ہمیشہ قائم رہے اور اسلام کی خدمت میں صرف ہو۔

بیوگی اور مصیبت کے ۴۵ سال میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کاٹ دیے اور اس آخری وقت میں جبکہ گور کی اندھیری کوٹھری میں جانے کا وقت نہ تھا کہ گھر سے باہر نکل کھڑے ہونے کا۔ میں یہاں تمہارے روبرو آ موجود ہوئی ہوں ؎

میرے دریائے بیتابی میں ہے ایک موج خون بھی

مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں تم کا وہ نعرہ ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ ایک ضعیف العمر عورت غریب الوطنی کی چادر اوڑھ کر آپ کے روبرو آئی ہے، اس لیے کہ آوارہ وطن ہو کر اور چند وارڈ کی کوٹھی سے نکل کر میں آپ کے پاس کوئی فریاد لے کر آئی ہوں۔ اگر میں محض اپنے بچوں کی عافیت وغیرہ کی طلبگار ہو کر آئی ہوتی یا حکومت کے مظالم کی فریاد لے کر آتی۔ یہاں مصائب کی داستان سناتی جو ایک سچے مسلمان کو امتحاناً جھیلنے پڑتے ہیں، تو یقین جانو کہ تمہارے دل غم سے بھر آتے۔ لیکن میں ان اغراض کے لیے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں بلکہ صرف پیغامِ عمل لے کر آئی ہوں اور یہ پیغامِ عمل نہ تمہاری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا اور جنہوں نے میری گود میں پرورش پائی۔ یہ سچ ہے کہ ضعیف العمر ماں کا دل شوکت علی و محمد علی جیسے بچوں کی محبت سے لبریز ہو سکتا ہے۔ میں بھی انسان ہوں اور میرا دل بھی جذباتِ محبتِ مادری سے ناآشنا نہیں۔ لیکن میرے عزیزو یاد رکھو کہ تم سب اپنے ماں باپ کے فرزند ہو۔ ماں باپ سے جو تعلق ہے، وہ رشتہ ہے اس رشتہ سے زیادہ مستحکم ایک اور تعلق بھی ہے جس کو تم بھول تو سکتے ہو مگر قطع نہیں کر سکتے۔

وہ رشتہ، وہ تعلق، وہ قرابت ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشۂ عافیت سے نکال کر یہاں لے آیا۔ اس جادو کا نام اسلام ہے اور وہ منتر

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے

میرے بچو! اگرچہ تم بھی ماں کی محبت بھری گود میں اور باپ کے سایۂ عاطفت میں پلے ہو۔ مگر یاد رکھو کہ تم سب سے پہلے اسلام کے فرزند ہو دنیا کے تمام رشتے ایک سانس کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں مگر رشتۂ مذہب تمہارے توڑے نہیں ٹوٹ سکتا۔

فرزندانِ اسلام تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ جس وقت میرے بچوں کی آزادی کے متعلق شملہ پر مشورے ہو رہے تھے اور خفیہ کا افسران کے پاس کچھ شرائطیں لے کر آیا تھا، وہ وقت شوکت علی اور محمد علی کے لیے ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ انسپکٹر منخفیان سے ایک تحریری وعدہ مانگ رہا ہے تو تم نے سنا ہوگا کہ میں کس طرح وہاں گئی اور میں نے اس سے اور شوکت علی و محمد علی سے کیا کہا۔

میں نے خفیہ پولیس کے انسپکٹر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا پیام حکومت کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دے اور ان کو اچھی طرح سنا دے کہ اگرچہ اس ضعیفہ و درسن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ایمان اتنا کمزور نہیں کہ شوکت علی اور محمد علی کو وہ جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنے کے لیے میرے بیٹے کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف اور مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اپنی اُس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراطِ المستقیم سے ہٹ سکیں اپنی ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی! میرے عزیزو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے وطن کی آسائش کو محبت مادری کی وجہ سے چھوڑا اور نظر بندوں کے ساتھ در در خاک چھانتی پھرتی ہوں تو بے جا نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے مجھے اتنے سبق دیے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنا کچھ سکھا دیا ہے کہ میرا دل اب دنیوی تعلقات سے آزاد ہو گیا ہے۔ میرا اصلی مدعا جس وجہ سے میں مہرولی سے لینسڈون اور بیتول سے چھندواڑے جاتے وقت ان کے ساتھ رہی صرف یہی نہیں تھا، میں جانتی ہوں کہ جس راہِ حق پر وہ چل رہے ہیں وہ مشکلات سے خالی نہیں ہے، اس میں بہت سے دھوکے ہیں، بہت سی ترغیبیں ہیں، گو میرے بچے ہمت والے ہیں پر مجھ سے زیادہ تجربہ کار یا مجھ سے زیادہ گرم و سرد دیکھے ہوئے نہیں۔ مجھے اُن کے ایمان

ایمان پر بھروسہ ہے پھر بھی میں ان کے ساتھ ہوں کہ اگر ذرا بھی ان کے ارادہ میں تزلزل، ان کے ایمان میں تزلزل، ان کے عزم میں کمزوری دیکھوں تو ٹوک دوں اور کہہ دوں کہ بس! آگے گمراہی اور ضلالت ہے!!

تم جانتے ہو کہ میں نے دو سال سے زیادہ خاموشی کے ساتھ اس طرح گذار دیے کہ گویا میں خود بھی شوکت و محمد علی کے ساتھ نظر بند ہوں، لیکن اب تم پوچھو کہ اس دو سال کی خاموشی کے بعد مجھے کس چیز نے کھینچ کر یہاں بلا لیا؟ تم سوال کرو کہ میں دنیا کی رسم و راہ کو بالائے طاق رکھ کر یہاں کیوں آ گئی؟ کونسی طاقت تھی جو مجھ کو چھندواڑہ سے کھینچ لائی؟ میں تمہیں ابھی بتاؤں گی! ابھی وقت تک کہ میرے لڑکوں کی آزادی کا مسئلہ موضوع بحث میں نہ آیا۔ میں خدا پر بھروسہ کیے صبر و شکر کے ساتھ بیٹھی رہی اور شاید اسی طرح بیٹھی رہتی اس لیے کہ مصائب و مظالم میرے لیے خوفناک چیز نہیں ہیں میں نے سمجھ لیا تھا کہ:۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

لیکن قسمت میں لکھا تھا کہ میں خود اپنا پیام بر کر نکلوں حکومت کے خود غرض اور انتقام پسند عمال نے جب دیکھا کہ شوکت علی اور محمد علی کی آزادی کا مسئلہ زیر غور ہے تو ان پر ایک ایسا الزام لگایا گیا جس کا جواب دینا ان پر فرض ہو گیا اور ان سے زیادہ مجھ پر۔ اس لیے کہ میں ان سے زیادہ آزاد تھی! وہ الزام یہ تھا کہ میرے بچے ان لوگوں سے ہیں جن کا اس وقت حکومت کے دشمنوں میں شمار کیا جاتا ہے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں اے فرزندانِ اسلام آج میں تمہارے سامنے کہتی ہوں کہ یہ الزام اسلام کی ایک ایسی توہین ہے، ایک ایسی اہانت ہے جس کو کوئی سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا اور جس کا جواب دینا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ کیا رشتۂ اخوت الٰہی کو کسی حکومت

کے بے شبہات اور جابرانہ احکام کاٹ سکتے ہیں؟ کیا حمیت وغیرت مذہبی کی اس عمارت کو جس نے تیرہ سو برس تک زمانہ کے بہت سے طوفان دیکھے ہوں، جاکروں کی نارضگی اور خفگی صدمہ پہنچا سکتی ہے؟ اے مسلمانو! آج میں تم سے اس سوال کا جواب مانگتی ہوں: کیا كُلُّ مُسْلِمٍ اِخْوَةٌ کے کوئی معنی نہیں؟ کون ہے جس کے دل میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، ٹرکی میں ہوں یا مراقش میں افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں ہوں یا شام کے سبزہ زاروں میں ہمدردی نہیں؟ اگر حکومت کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف شوکت علی و محمد علی ہی باغی نہیں، ہندوستان کے ۷ کروڑ مسلمان باغی ہیں! اور اگر حکومت نے یہ سوال پیدا کیا ہوتا اور اس غدر کو اپنے طرز عمل کے لیے پردہ نہ بنایا ہوتا تو شاید میں اب بھی باہر نہ نکلتی۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں اب سوال میرا تمہارا نہیں۔ سوال اسلام کا ہے۔ اس وقت تم کو اور تمہارے مذہب کو ایک سخت امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم اس سے کامیاب اور سرخرو نکلو!

میری تقریر طویل ہو گئی لیکن دل میں جب درد ہوتا ہے تو الفاظ کی طوالت نگاہ میں نہیں رہتی۔ زخم جب ہرے ہوتے ہیں تو ضرور رستے ہیں۔ ادھر تو ہندوستان کا کتنا ہی بیش قیمت خون میدان جنگ میں برطانیہ کے لیے بہہ گیا اور ادھر ہم کو غیر وفاداری اور بغاوت کے طعنے دیے جا رہے ہیں۔ پہلے تو گورنمنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ اسلام کے مقدس مقامات میں دخل اندازی نہ کرے گی اور اس وعدے کی خلاف ورزی کی پھر یہودیوں سے بیت المقدس میں خاص مراعات کیلئے گفت و شنید شروع کر دی اور دوسری طرف عرب کے باغی کو ایک آزاد حکمران سمجھا گیا۔ میرے عزیزو! یہ واقعات ایسے نہیں کہ کانوں سے دل تک نہ جائیں اور دل سے زبان تک نہ آئیں۔ اس وقت مخاصمین کے توپوں کے گولے مقامات مقدسہ اسلامی کی دیواروں کے سایہ میں گر رہے ہیں اور

میرا پیام صرف وہی ہے جو ہر مسلمان کو تیرہ سو برس پہلے مل چکا ہے اور جو ہر مسلمان کے قلب پر نقش ہونا چاہیے یعنی:-

یا ایہا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین ○ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون ۔ ولنبلونکم بشیءٍ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین ○ الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیہم صلوٰت من ربہم ورحمۃ واولئک ہم المہتدون ○

میرا پیام صرف وہی ہے جو ہر مسلمان کو تیرہ سو برس پہلے مل چکا ہے اور جو ہر
مسلمان کے قلب پر نقش ہونا چاہیے یعنی:-

یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع
الصابرین ۝ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء
ولکن لا تشعرون ۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من
الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین ۝ الذین اذا اصابتھم
مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیھم صلوٰۃ من
ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون ۝

تحریک خلافت کے پرآشوب زمانے میں ہندوستان کے
تمام مسلمان ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح، انگریز
سامراج کے مقابلہ میں سدِ سکندری بن کر ڈٹ گئے تھے،
لیکن امت اسلامیہ کے بعض قابل صد احترام بزرگ
اس تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر قرار دیتے تھے انہی
میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم و مغفور بھی تھے،
حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے مولانا تھانوی کے
فتوے کا جو عالمانہ جواب دیا تھا وہ ذیل میں درج ہے۔

رئیس احمد جعفری

خانقاہ اشرفیہ کا مخالفانہ فتویٰ

مولانا شبیر احمد عثمانی کا مدلّل جواب

یرا فرض ہے کہ اپنی اور آپ کی بلکہ روئے زمین کے سارے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والے مسلمانوں کی فلاح سے متعلق شرعی حیثیت سے جو میرے معلومات ور خیالات ہیں اُن کو بلا کم و کاست آپ کے سامنے رکھدوں اور اس کی بالکل پرواہ کروں کہ حق کی آواز سننے سے حضور ویسرائے بہادر مجھ سے برہم ہو جائیں گے یا مسٹر گاندھی ی برادران یا اور کوئی ہندو یا مسلمان مجھ سے بگڑ بیٹھے گا۔ اگرچہ اپنے بھائیوں سے مجھے ایسی توقع نہیں۔

آج وہ وقت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فرد کو جماعت اسلام کی حقیقی خیر خواہی ینی شخصی عزت اور عارضی وجاہت و مقبولیت سے قطع نظر کر لینا چاہیے ثمانؓ کے بڑے بڑے سردار خلافت رسولؐ کے سب سے بڑے مسند نشین کی ت و شوکت جب خاک میں ملا دی جائے تو آپ کی عزت و وجاہت کس شمار میں ہے۔ تھریس اور سمرنا کے مسلمان زن و مرد جب بے آبرو کیے گئے ہوں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ بے آبرو نہیں ہوئے۔

جس قوم نے عراق، شام، فلسطین، تھریس، ایشائے کوچک اور قسطنطنیہ لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ تمام دنیا کی مقدس ترین مساجد کو خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں سے چھینا۔ اور اس چھیننے کے لیے جو جنگ کی گئی اس کو کروسیڈ (صلیبی جنگ) سے تعبیر کیا۔ مکہ اور مدینہ پر اسلام کے ایک ایسے باغی کی حکومت قائم کرائی جس کے

عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۔

رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل کی۔

ایمان باللہ کے یہ معنی نہیں کہ آدمی محض زبان سے اٰمَنْتُ بِاللّٰہ کا دعویٰ کرے او
جب اس امت کی آزمائش کا موقع آئے تو خدا کے روبرو جھوٹا ثابت ہو۔ اگر
ایمان باللہ کا مصداق صرف اتنا ہی ہوتا تو انبیا کی زبانی منافقین اس قدر رسو
نہ کیے جاتے اور نہ جہنم میں سب سے نیچے کا طبقہ اُن کا مسکن بنایا جاتا اور د
حق تعالےٰ یوں فرماتے۔

اَلٓمّٓ ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا
اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَ
لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا
وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۔

کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صر
اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی
آزمائش نہ ہوگی حالانکہ ہم نے اُن سے پہ
لوگوں کا امتحان کیا ہے تو ضرور ہے کہ جا
کرے گا اللہ ان کی جو سچ بولتے ہیں اور
جو جھوٹے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو زبان سے
کلمہ پڑھتے تھے اور بجائے خود وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ لیکن جب کوئی تکرا
اور نزاع پیش آتی تو وہ بجائے کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے
معاملات کفار کے پاس لے جانے کو پسند کرتے تھے تاکہ وہ اُن کے حسب خواہش
فیصلہ کر دیں ایسے لوگوں کی نسبت حق تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ
اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا دعو
ہے کہ وہ اُس پر جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور
اُس پر جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا ایمان لائے

إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا
أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ
أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا وَإِذَا
قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَ
إِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ
يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۔

ہیں (اور پھر بھی) وہ چاہتے ہیں کہ اپنے نزاعات
کو شیطان کی طرف لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا
گیا ہے اس سے بیزار رہنے کا۔ اور شیطان چاہتا
ہے کہ ان کی گمراہی کو بہت دور تک پھیلاتا چلا
جائے اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس
چیز کی طرف بڑھو جو خدا نے نازل کی۔ اور رسولؐ
کی طرف (جسے خدا نے بھیجا) تو تم منافقین کو
دیکھو گے کہ وہ تم سے اعراض کرتے ہیں۔

اب آپ دیکھ لیجیے کہ کتنے مسلمان ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنے معاملات کی باگ کفار اور شیاطین کو چھوڑ کر کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ اللہ کے ہاتھ میں دیدی ہے یا انسانی قوانین اور شیطانی احکام کے آگے وہ گردنیں موڑ دیتے ہیں لیکن جب انکو کوئی آسمانی حکم اور قدوسی پیغام دیا جاتا ہے تو وہ تیوریاں چڑھاتے ہیں ـــــ اے خدا کی زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے رہنے والو! کیا اس شہنشاہ مطلق احکم الحاکمین کی حکومت کا حلقہ تمھاری گردنوں میں نہیں رہا جو تم نے انسانی رعب و داب سے خوف زدہ ہو کر اس سے بغاوت پر کمر باندھی ہے؟ خوب سمجھ لو! کہ خدا کی گرفت بہت سخت ہے، جب اس کی شمشیرِ انتقام بے نیام ہوتی ہے اور اس کے عذاب کا کوڑا برسنے لگتا ہے تو پھر اس کے مجرم کے لیے کہیں پناہ نہیں لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ مسلمان اپنے اوپر رحم کھائیں اور اٹل ہیں جو عہد انھوں نے اپنے خدا سے باندھا ہے اسے پورا کریں اور سب مل کر خدا کی نہ ٹوٹنے والی رسّی کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑ لیں کہ یہ رسّی ٹوٹ تو نہیں سکتی لیکن چھوٹ سکتی ہے۔

حضرات مذہب اسلام ایک مکمل مذہب ہے۔ جس میں قیامت تک پیش آنے والی ضرورتیں مسلمانوں کو سمجھا دی گئی ہیں۔ کوئی حالت سختی اور آسانی کی ایسی نہیں جس کا بیان کسی نہ کسی طور سے خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے کلام میں نہ ہو۔ اور ہماری سہولت کے لیے فقہاء مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم نے کتاب و سنت سے بیشمار احکام مستنبط کر کے اپنی کتابوں میں درج فرما دیے ہیں۔ اس لیے یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ اسلام کی جو ضروریات مہتمہ اس وقت پیش نظر ہیں ان کے متعلق کوئی حکم اور کوئی تبصرہ حق تعالےٰ کے کلام میں نہ ہو۔

قرآن حکیم نے فتح و نصرت، اور ہزیمت و مغلوبیت کے سب اسباب اپنے معجز بیان طرز میں بتلا دیے ہیں۔ اس نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کیا ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل و خوار نہیں ہوتی جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے، خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں، اس لیے ہمیں بجائے اس کے کہ ہم دشمنوں کے مظالم شمار کریں ان مظالم کا محاسبہ کرنا چاہیے جو ہم نے خود اپنے اوپر نازل کیے ہیں۔ تنبیہاً عرض کرتا ہوں کہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں غالباً دو مرتبہ لشکر اسلام کو کفار کے مقابلہ میں ہزیمت ہوئی ہے وہ بھی عارضی۔ ایک غزوۂ احد میں جبکہ تیر اندازوں کی جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدول حکمی کی۔ اور آپس میں مختلف ہو گئے اور دوسرے غزوہ حنین میں جبکہ ان کو اپنی کثرت تعداد پر غرور ہوا اور وہ یہ سمجھے کہ ہمارا اتنا بڑا لشکر کسی طرح مغلوب نہیں ہو سکتا۔

ان دونوں مواقع میں حق تعالےٰ شانہ نے ان کی ہزیمت کو نہ تو فوج کی کمی سے منسوب کیا نہ ان کی بے سروسامانی سے اور نہ ان کے دشمنوں کی شان و شکوہ سے۔ البتہ قرآن مجید میں اُحد کے متعلق تو یہ فرمایا۔

حَتّٰى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ

تا آنکہ جب تم نے بزدلی کی اور امر دینی میں جھگڑنے لگے اور عدول حکمی کی اس کے بعد کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھلائی جس کو تم پسند کرتے ہو تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کو طلب کرتے ہیں اور بعضی وہ ہیں جن کو آخرت مطلوب ہے۔

اور حنین کے بارے میں یہ ارشاد ہوا۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۚ

اور حنین کے دن جبکہ تمہاری کثرت نے تمہیں مغرور بنا دیا پھر وہ کثرت تم کو کچھ بھی مستغنی نہ کر سکی اور تم پر زمین باوجود وسعت کے تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

حضرات آپ صحابہؓ کے ایمان و تقویٰ اور صبر ثبات کو دیکھ لیجیے۔ اور یہ بھی کہ اُن کے درمیان خدا کے پیارے رسولؐ جلوہ افروز تھے۔ مگر ایک تھوڑی سی بے اعتدالی سے تمام مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ پس آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ ہم میں وہ کتنے اجزاء قوت ایمانیہ اور عمل صالح اور طاعت ربانی کے باقی ہیں۔ جن کی وجہ سے خدا ہم کو اپنا دوست قرار دے اور اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے سزا نہ دلائے۔

میرا مشورہ سب سے پہلے یہ ہے کہ تمام علماء مل کر مسلمانوں کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں فشل (بزدلی) تنازع (نااتفاقی)، اور عصیان یعنی نافرمانی، اور اعجاب و غرور سے بچانے کی کوشش کریں۔ اور اُن کا شیرازہ مجتمع کریں اور جو اختلافات

وہاں نہ تھا جو ان کی حفاظت کرتا، خط لکھنے سے میری غرض یہ تھی کہ کفارِ مکہ میرے اہل
عیال کے بارہ میں میری کچھ رعایت کریں اور یہ میں یقین رکھتا تھا کہ اللہ ضرور اپنے
وعدے جو اپنے رسولؐ کے ساتھ کیا ہے پورا کرے گا۔ اور میرا خط اُن لوگوں کو خدا کی
سزا سے نہیں بچا سکتا۔

ان واقعات کو پڑھ کر آپ بتایئے کہ کیا حضرت حاطبؓ کو کفار کے ساتھ دلی
محبت قلبی اور دوستانہ تعلق تھا؟ کوئی شخص ایک صحابی بدری کی نسبت یہ یقین نہیں
کر سکتا۔ البتہ ایک ظاہری معاملہ معاونت کا انھوں نے کفار کے ساتھ ایسا کیا تھا جو
ایک رفیق، رفیق کے ساتھ کرتا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا	اے مسلمانو میرے دشمن اور اپنے دشمن کو
عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ	یار مددگار مت بناؤ، پیغام بھیجتے ہو اُن
تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ ۔ وَ	کی طرف دوستی کا۔ حالانکہ وہ منکر ہوئے ہیں اس
قَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ	سچائی سے جو تمہارے پاس آئی ہے۔

پس بداہتہً ثابت ہوا کہ موالات صرف محبت قلبی تک محدود نہیں بلکہ ہر ایسا معاہدہ
اور ہر ایسی اعانت و امداد جس سے ایک دوسرے کی رفاقت مترشح ہوتی ہو موالات کے
تحت میں داخل ہے، اگر آپ اس سے زیادہ وضاحت چاہتے ہیں تو تفسیر البیان جلد
ذیل کا واقعہ پڑھیے۔

عن ابی موسیٰ قال قلت لعمر	ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت
بن خطابؓ ان لی کاتبا نصرانیا	عمرؓ سے کہا کہ میرے پاس ایک نصرانی کاتب
فقال مالك ولہ قاتلك اللہ و	ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم کو اس سے کیا
تلا ھذہ الایۃ یا ایھا الذین آمنوا	تعلق؟ کیوں تم نے ایک مسلمان کا تقرر کیا
لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء	تم نے اللہ کا یہ کلام نہیں سنا۔ یا ایھا الذین

قلت له دينة ولى كتابته فقال
الاتتخذوا اليهود والنصارىٰ اولياء
فلا أكرمهم اذ اهانهم الله
ولا أعزهم اذا اذلهم الله
ولا ادنيهما اذا ابعدهم الله
قلت انه لا يتم امر البصرة
الابه فقال مات النصرانى
والسلام يعنى هب انه مات
فما تصنع مجدا فما تعمله بعد
موته فاعمله الآن واستغن
عنه لغيره من المسلمين۔

میں نے عرض کیا کہ اس کا مذہب اس کے لیے ہے اور اس کی کتابت میرے لیے۔ فرمایا میں اس کا اکرام نہیں کر سکتا جبکہ اللہ نے اُن کی اہانت کی ہے اور میں اُن کی کوئی عزت کر سکتا ہوں جبکہ خدا نے انھیں ذلیل کیا ہے اور نہ میں انھیں نزدیک کر سکتا ہوں جبکہ اللہ نے انھیں دور پھینک دیا ہے۔ میں نے عرض کیا بصرہ کا انتظام بدون اس کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ فرمایا نصرانی مر گیا تو تم کیا کرو گے جو اس کی موت کے بعد کرو وہ اب بھی کر لو۔ اور کسی مسلمان سے کام لے کر اس سے مستغنی ہو جاؤ۔

میں خیال کرتا ہوں کہ ایسی ایسی صریح تفاسیر کے بعد ہر ایک سمجھ دار آدمی یقین کرے گا کہ ترک موالات اور ترک تعاون متقارب الفاظ ہیں۔ ہاں ترک تعلقات یا ترک معاملات ان دونوں میں اُن دونوں سے کچھ زیادہ تعمیم ہے، ہماری غرض صرف اس قدر ہے کہ جو تعلقات اور معاملات موالات اور مناصرت کے تحت میں آجائیں وہ حرام ہیں۔ اور جن تعلیم یافتہ لوگوں نے ترک موالات کے خلاف مضامین لکھے ہیں اُن کو بھی انجام کار ایک بڑا حصہ ظاہری افعال و معاملات کا موالات کے تحت میں داخل کرنا پڑا ہے۔

بلاشبہ ترک موالات کا حکم ایک دائمی اور عام حکم ہے لیکن اس قوم کے مقابلہ میں وہ اور زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے جس نے اعلانیہ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور اُن کو انکی بستیوں سے نکالا۔ اور ان کے نکلنے میں مدد دی۔ ایسے ظالموں کے ساتھ کسی نرمی اور مروت

انگریزی تعلیم گاہوں کے متعلق ترک موالات کے سلسلہ میں ہم فی الحقیقت اُن ہی شرائط کو پورا کرانا چاہتے ہیں جن کے بعد ایک اجنبی زبان کا سیکھنا اور دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنا شرعاً جائز ہے، اور مسٹر محمد علی وغیرہ بھی ایک حد تک اسی کوشش میں ہیں۔

یہ بات بہت زیادہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو مسلمان قوم اپنی بدبختی سے کسی کافر قوم کے زیر اثر آگئی ہو، اور اپنے ہاتھ پاؤں غیر مسلم حکمرانوں سے خوب بند ہوا چکی ہو۔ اس کی قابل تاسف بیچارگی کا خیال فرما کر حق تعالےٰ شانہ نے ترک موالات کے حکم میں تھوڑی سی گنجایش بھی رکھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً۔	مسلمان مسلمانوں کے سوا کافروں کو اپنا یار و مددگار نہ بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا اس کو اللہ سے کچھ سروکار نہیں۔ مگر یہ کہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرتے ہو۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

عن ابن عباس نھی اللہ المومنین ان یلاطفوا الکفار ویتمندوھم ولیحبۃ من دون المؤمنین الا ان یکون الکفار علیھم ظاھرین فتظھر لھم اللطف ویخالفونھم فی الدین وذالک قولہ تعالیٰ الا ان تتقوا منھم تقٰۃ۔	حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ نے مسلمانوں کو اس سے روک دیا ہے کہ وہ کفار سے ملاطفت کا برتاؤ کریں اور مسلمانوں کے سوا ان کو اپنا رازدار بنائیں مگر یہ کہ کفار ان پر غالب آجائیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ اظہار لطف کے ساتھ ساتھ مذہبی معاملات میں ان کے مخالف رہیں اور یہی مطلب ہے خدا کے کلام الا ان تتقوا منھم تقٰۃ کا۔

اس قدر رعایت سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ترک موالات کے مخاطب یہ محکوم قوم بالکل نہ رہی۔ یا موالات کفار کی حرمت اصلی سے جاتی رہی بلکہ الا ان تتقوا منہم تقٰۃ کا استثنا اگر منسوخ نہیں ہوا جیسے بعض سلف کا قول ہے تو وہ محکوم و مقہور مسلمانوں کو بھی اس سے آگاہ کرتا ہے کہ ترک موالات میں اپنے بچاؤ کا پہلو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے اور اسی اعتبار سے ترک موالات کے حکم میں استثنا میرے نزدیک آیۃ جہاد کے اس استثنا سے مشابہ ہوگا جو مَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗ کے ساتھ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ سے کیا گیا ہے۔

پس ترک موالات کے وقت ایک محکوم و مقہور قوم کو حاکم و قاہر قوم کے مقابلہ میں اپنے نفع و ضرر کا پورا پورا موازنہ کر لینا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسی صورت نہ اختیار کی جائے جس سے مسلمانوں کی عام ہلاکت کا اندیشہ ہو یا وہ بحالت موجودہ اُن کی طاقت سے باہر یا ناممکن العمل ہو اور غالباً اسی مصلحت سے تحریک ترک موالات کے حامیوں نے اس پر عمل کرنے کے تدریجی منازل قائم کیے ہیں۔

اور شاید اسی طرح کی مصلحت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں کفار کی مقاطعت ٹوٹ جانے کی دعا فرمائی کہ اس حالت میں ضعف و قلت و مجبوری میں اس سے سراسر مسلمانوں کا نقصان تھا۔ اور اس کی مجبوری کی وجہ سے مکہ کی زندگی میں آپ کو کفار کے مقابلہ پر سیف و سنان سے کام لینے کا حکم نہیں ہوا بلکہ برابر صبر اور کف ید کی تعلیم دی جاتی رہی۔

اس موقعہ پر یہ بھی فراموش نہ کیجیے کہ نفس بیع اشراف اجارہ وغیرہ معاملات موالات میں داخل نہیں۔ ہاں اگر بیع ایسی چیز کی کافر محارب کے ہاتھ کی جائے جس سے وہ مسلمانوں کے مقابلہ پر کام لے گا۔ مثلاً ہتھیار کی یا لوہے کی جو ہتھیار کا مادہ ہے۔ تو اس کو ہدایہ وغیرہ میں ممنوع لکھا ہے اور قرآن شریف میں وارد ہے کہ

ہیں۔ حالانکہ اب سے چالیس برس پہلے جب یہی وعظ سرسید نے علیگڈھ کالج کی
بنیاد رکھتے وقت کہا تھا۔ اس وقت تمام علماء ربانیین نے اس پر کیا کیا فتوے
دیئے تھے۔ سرسید یہی تو کہتے تھے کہ اگر مسلمان اس وقت انگریزی تعلیم نہ پائیں
گے تو ان کو سرکاری ملازمتیں نہ ملیں گی۔ پھر یا تو ان کو ہندوؤں کی غلامی کرنی پڑے گی
یا وہ دوسری قسم کے ذلیل افعال مثل دھوکا، فریب، گداگری، چوری، ڈکیتی وغیرہ کے
مرتکب ہوں گے یا جو کچھ گھر میں سرمایہ ہوگا اس کو چاہیں گے اور بعید گھر اور
جائداد بنیوں کے حوالے کریں گے، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن آپ کو معلوم ہوگا کہ اکابر علماء نے ایک نہ سنی اور ان اندیشوں
کا شاید یہی جواب دیتے رہے کہ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ
وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ترجمہ: شیطان تم کو افلاس سے ڈراتا ہے اور
بےحیائی کا حکم کرتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے
اور وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً فَسَوْفَ یُغْنِیْکُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ
یعنی اگر تم تنگی سے ڈرتے رہو تو اللہ تم کو جلد اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

اخبار مشرق کے ایک مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ "افسوس لیڈران قوم نے
اس وقت اپنے سچے خیرخواہوں کو بدخواہ اور گاندھی جیسے حقیقی دشمنوں کو خیرخواہ
سمجھ لیا ہے وہ ہماری تو کیا سنیں گے اپنے مسلم عاقل یعنی سرسید کی تعلیم کو بھی
نہیں مانتے۔ جن تعلقات کی آج یہ لوگ بے قدری کر رہے ہیں۔ یہ وہ تعلقات
ہیں جو سرسید نے اپنا اور ان کا دین و ایمان آبرو اور عزت بیچ کر قائم کئے
تھے۔ اب تم جان سکتے ہو کہ یہ تعلقات تم کو کس قدر گراں قیمت پر پڑے ہیں
پس یہ سخت غلطی ہوگی کہ ایسی گراں خریدی ہوئی چیز کو یوں مفت ہندوؤں کے حوالے
کر دو۔ (۱-۲) سے زیادہ اور کیا بےعقلی ہوگی۔"

ان دنیدہ لکن جلوں اور خصوصاً خط کشیدہ الفاظ کو غور سے پڑھیے، یہ لوگ خود اقرار کر رہے ہیں کہ جن سرکاری تعلقات کے ترک پر اس وقت زور دیا جا رہا ہے وہ سرسید نے دین و ایمان اور عزت و آبرو سب بیچ کر خریدے تھے۔ پس اب میں اُن ہی کو حَکَم ٹھیراتا ہوں کہ کیا ایسے تعلقات کا رکھنا ایک مسلمان کو ایک منٹ کے لیے بھی جائز ہے اور کیا اب بھی اُن تعلقات کا موالات ہی سے مختلف ہونا محل ورود ہے۔

مشورہ دیا گیا ہے کہ ان تعلقات کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ اور اپنا کھویا ہوا دین و ایمان واپس لینے کی کوشش کرو۔ مگر حضرت واضح رہے کہ جس چالاک گاہک کے ہاتھ یہ معاملہ ہوا ہے وہ اس قدر پاگل نہیں کہ آپ کے پاس اپنی پونجی بھی رہنے دے اور اتنی بڑی قیمت بھی واپس کر دے۔ اگر اتنا ہی سے کام چل جائے تب بھی خدا کا ہزاراں ہزار شکر کیجیے۔

بہت لوگ کہتے ہیں کہ ہندو یہ سب کوششیں سوراج حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں، میں کہتا ہوں کہ نہ فقط ہندوؤں کا بلکہ بعض مسلمانوں کا بھی یہی مقصد ہے، لیکن آپ اس مقصد کو مایوس کیوں سمجھتے ہیں؟ اگر ہندوستان کو سوراج یعنی حکومت خود اختیاری حاصل ہو جائے تو ہندوستان کے محاصل و وسائل ہندوستان کی مرضی کے خلاف صرف نہیں کیے جا سکیں گے، اور عراق و فلسطین و قسطنطنیہ پر انگریزی قبضہ بہت دشوار ہو جائے گا۔ اور نہ اس سے بھی کیا کم کہ آئندہ مسلمانوں کے مقابلہ پر ہندوستان نہ جا سکے گا۔ اس سبب کے علاوہ یہ کہ ہم کو ہندوؤں کی نیت سے کیا تعرض ہے جبکہ خود ہمارا مقصد صحیح ہو وطن پرستی اور قوم پرستی بیشک اسلام کی کوئی اصطلاح نہیں۔ اور یہ اصطلاحیں شاید یورپ سے لی گئی ہوں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی قوم اور وطن کا تحفظ ہمارے فرائض سے خارج ہے، آپ

جانتے ہیں کہ جو ملک ایک مرتبہ مسلمانوں کے جھنڈے تلے آجائے اگر اس کا ایک چپہ کفار لینا چاہیں تو بتدریج شرق سے غرب تک کل اہل اسلام پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر تحفظ ملک و قوم کے لیے مسلمان کوئی قربانی کریں تو اس کو ہمیشہ یورپ کی تقلید سمجھ لینا خطا ہے۔

بڑی مشکل یہ آن پڑی ہے کہ تحریک ترک موالات کے بعض مخالفین انگریزی حکومت کی کوئی قدر نہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کو دنیا کی تمام موجودہ حکومتوں سے افضل اور بابرکت سمجھ رہے ہیں۔ چنانچہ مشرق میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ

"جو حکومت مسلمانوں کو اُن کی مذہبی شعائر میں پوری آزادی دیتی ہے ان کے جان و مال و آبرو کی محافظ ہے۔ قرآن و رسولؐ کی بے حرمتی کو قانوناً جرم قرار دیتی ہے، بیت اللہ و بیت الرسولؐ کی زیارت سے نہیں روکتی اس کے ساتھ ترک تعلقات کس طرح واجب ہو سکتا ہے باقی شریف مکہ یا اُس کی فوج نے یا اُن کے ساتھ ملکر انگریزی فوج کے مسلمانوں نے جو کچھ مکہ اور مدینہ کی بےحرمتی کی ہے اس کی بابت غیروں کو الزام دینا فضول ہے۔ یہ سب کچھ خود مسلمانوں کے ہاتھوں کے کیے ہوئے کام ہیں اور ہنگامہ کانپور میں جو کچھ ہوا اُن کے ذمہ دار وہ لیڈر قوم ہیں جنھوں نے گورنمنٹ کو غلط فتویٰ دیا"

"ہندوستان میں انگریزی حکومت کو سو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر اس زمانہ میں مسلمانوں کے دین و مذہب پر اس کا کیا اثر ہوا اس کو سیاحان عالم سے پوچھو۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان سے زیادہ کسی جگہ کے مسلمانوں میں دینداری کی روح نہیں اور اگر ان کا یقین نہ آئے تو خود جاکر ترکی اور عرب، مصر اور افغانستان

کے مسلمانوں کو دیکھ لو کہ آزادی کی زہریلی ہوا نے ان کے دین کو کس طرح برباد کیا۔ مشاہدہ کے بعد تم خود کہو گے کہ ہندوستان سے زیادہ دینداری کسی ملک میں نہیں۔"

"انگریزی حکومت کا جو اثر مسلمانوں کے دین و مذہب پر ہوا اس کو تو آپ نے دیکھ لیا کہ ہندوستان اس وقت دینداری میں اسلامی ممالک سے بھی سبقت لیے ہوئے ہے"۔

میں صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ عراق، شام، فلسطین اور .... تھریس وسمرنا کے کلمہ پڑھنے والوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کیا مسلمانوں کی جان و مال اور عزت آبرو نہیں ہے؟ کیا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ، اَلْمُؤْمِنُونَ يَدٌ عَلٰی مَنْ سِوَاهُمْ خدا اور خدا کے رسول کا کلام نہیں؟ کیا امرتسر کے بازاروں میں رینگنے والوں میں سے کوئی مسلمان نہ تھا؟ کیا بیت المقدس شعائر اللہ میں سے نہیں؟ کیا مکہ مدینہ میں اگر انگریزی فوج کے مسلمان گئے ہیں وہ بدون انگریزی حکومت کے حکم کے خود بخود چلے گئے؟ کیا ان مسلمانوں یا شریف مکہ کے مجرم ٹھیرنے سے انگریزی عمال بے قصور ثابت ہو جاتے ہیں؟ کیا کانپور میں صحیح فتویٰ معلوم ہو جانے اور چاروں طرف کے مسلمانوں کی آواز بلند ہونے کے بعد خونریزی اور گرفتاریاں نہیں ہوئیں؟

یہ صحیح ہے کہ دین کے بہت سے اجزاء میں ہندوستان ممالک اسلامیہ سے فائق ہے اگرچہ بعض اجزاء دین یعنی خدا کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور اعلائے کلمۃ اللہ اور نزال عن الاسلام والمسلمین کے وظیفہ سے تقریباً محروم ہے لیکن یاد رکھیے کہ یہ دینداری انگریزی حکومت کی برکات میں شمار نہیں ہو سکتی۔ بلکہ چند ایسے نفوس قدسیہ کی صرف ہمت اور بذل قوت کا نتیجہ ہے جو اس سرزمین میں ہماری خوش قسمتی سے پیدا ہوئے۔ اور جنھوں نے اپنی نہایت ہی خداداد قابلیت

روحانی طاقت۔ اور حیرت انگیز جراءت سے نصاریٰ اور متنصرین کے اثر کا مقابلہ کیا۔ ان
مقدس بزرگوں میں سے حضرت الشیخ الاجل مولینا حاجی محمد امداد اللہ قدس اللہ سرہ
تھے جنہوں نے آخر کار انگریزی حکومت کے دائرہ سے نکل کر حرم شریف کو اپنا مسکن
بنایا اور حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ روحہ تھے جو ایک مدت تک
انگریزی حکومت کے احکام گرفتاری کے عکس میں نانوتہ اور دیوبند کا گشت لگاتے رہے
اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ روحہ تھے، جنھوں نے انگریزی حکومت
کی برکات کو محسوس نہ کر کے مہینوں تک حوالات کی کوٹھری میں رہنا پسند کیا۔ اور
سب سے آخر میں وحید العصر حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی ہیں۔ جن
کی دردانگیز داستان آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

نہایت قلق سے کہنا پڑتا ہے کہ ان سب بزرگوں کو جن کے دم سے ہندوستان میں
یہ دینداری ہے انگریزی حکومت کی وہ برکات محسوس نہ ہو سکیں جن کا ہمارے دوست
اس شد و مد کے ساتھ دعویٰ کر رہے ہیں۔ شاید ان کا یہ دعویٰ بھی انگریزی حکومت
کے برکات میں سے ایک برکت ہو۔

بہت سے علماء کو یہ شکایت ہے کہ "مسلمان خطاب واپس کرتے اور ملازمتیں
چھوڑتے ہیں۔ مگر وہ الحاد و زندقہ۔ فسق و فجور، حب دنیا۔ حب جاہ اور کفار کے
وہ اوضاع و اطوار نہیں چھوڑتے جو انھوں نے یورپ سے لیے ہیں اور جو کہ حقیقۃً
موالات ہیں۔ پس مسلمانوں کو چاہیے کہ اس موالات کو سب سے پہلے چھوڑیں اور
اپنی صورت، اپنا لباس، اپنی معاشرت، اپنے خیالات اسلامی طریقہ پر بنائیں۔ اور
اوضاع و اطوار کفار اور ان کے خیالات سے پرہیز کریں کانفرنسوں اور کمیٹیوں کے
جلسوں کی ہیئت کذائی میں یورپ کی نقل اتارنا، اور ان کے طرز پر استقبال اور
آرائشیں اور ریزولیوشن وغیرہ پاس کرنا ڈاڑھیاں منڈانا۔ مونچھیں بڑھانا۔ انگریزی

کوٹ پتلون وغیرہ پہننا، یا ہندوانہ صورتیں بنانا، صوم و صلوٰۃ وغیرہ کا پابند نہ ہونا بلکہ اس کا استہزا کرنا۔ اپنی نجی مجالس میں بے ضرورت انگریزی ہی بولنا یہ سب وضائع و اطوار کفار ہیں داخل ہیں، اور ان کا ارتکاب یقیناً موالات کفار ہیں سے ہے بلا شبہ یہ امور بھی موالات کے تحت میں داخل ہیں۔ اگرچہ موالات کا مفہوم ان ہی میں منحصر نہیں اور یقیناً علماء کا فرض ہے کہ وہ ترک موالات کے انتظام کے عمل میں ان چیزوں کو مقدم رکھیں۔ لیکن یہ معنی نہیں کہ علماء کی کوشش محض ان ہی مفاسد کی اصلاح تک محدود ہو جائے، اور وہ کسی ایسے اسلامی مسئلہ ایں دخل نہ دیں جس میں گورنمنٹ کی ان سے کسی قسم کے خطرہ کا امکان ہو۔

بہت سے خیر خواہ ہندو مسلم اتفاق کے خواتیں اور عوام الناس اور بعض لیڈر رولا کی ان غلط کاریوں پر متنبہ فرما رہے ہیں جو اس اتفاق کے جوش سے پیدا ہوتی ہے مثلاً قربانی گاؤ میں بعض جگہ تشدد یا مزاحمت کیا جانا۔ یا قربانی کے جانور کو سجا کر رضاکاران خلافت کا گئو شالہ میں پہنچانا۔ یا قشقہ لگانا۔ یا ہندوؤں کی ارتھیوں کے ساتھ خصوصاً "رام رام ست" کہتے ہوئے جانا یا یہ کہنا کہ امام الہندی کی جگہ امام گاندھی تشریف لائے ہیں، یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے یا قرآن و حدیث میں بسر کی ہوئی عمر کو شارمت پرستی کرنا یا یہ دعا کرنا کہ اگر میں کوئی مذہب تبدیل کروں تو سکھوں کے مذہب میں داخل ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

بلا شبہ میں بھی جب اپنی قوم کے بڑے سر بر آوردہ افراد کو سنتا ہوں کہ وہ اس قسم کے بحربات یا کفریات کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بیدھڑک نکال دیتے ہیں جن کو سنا ایک سچے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو میرا طبیعت پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اور قصد کرتا ہوں کہ اس طوفان بے تمیزی کا روکنا جب اپنی قدرت میں نہیں تو ان معاملات سے بالکل یکسوئی بہتر ہے۔

مگر پھر شیطان آخرش اور الجام من النار والی وعیدیں یاد آتی ہیں اور
فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ امید کی ایک جھلک پیدا کرتی ہے تو ناچار
فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا اپنے خیالات اس سلسلہ کے ہر ایک پہلو پر والکان طرح
سے ظاہر کر دینے چاہئیں ۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم — تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال

اگر علماء حضرات نے ادھر توجہ نہ کی یا باوجود علماء کی کوشش بلیغ کے ان میں
گزری ہوئی خرابیوں کا کوئی انتظام نہ ہوا تو عجب نہیں کہ بہت سے نیک نیت
ان مجالس اور تحریکات کی شرکت سے برداشتہ خاطر ہو جائیں اور اس طرح ترک
موالات کو بڑا صدمہ پہنچ جائے ۔

میری درخواست یہ ہے کہ سب علماء افراط و تفریط سے خالی ہو کر مصالح اسلامیہ
کی حمایت ۔ اور مفاسد عامہ کا استیصال پوری طاقت کے ساتھ کریں ۔ اور کسی معاملہ میں
صرف ایک ہی طرف نہ جھک پڑیں کہ اس وقت مسلمانوں کی کشتی بڑے گہرے بھنور
میں ہے ۔ ناخداؤں کو پوری طرح ہوشیار اور مستعد رہنا چاہیے ۔

اب مجھے صرف اس قدر اور کہنا ہے کہ ایک اولڈ بوائے صاحب کے
ہیں جو اخبار "مشرق" گورکھپور کی گیارہ نومبر کی اشاعت میں انسٹیٹیوٹ گزٹ
کیا گیا تھا ۔ حضرت شیخ الہند کے فتوے ترک موالات پر کچھ اعتراضات کیے گئے
جن میں سے بعض چیزوں کا ذکر تو بندہ کے اسی مضمون میں ہو چکا ہے اور جو
باقی ہے والدین کی اطاعت سے متعلق ہے ۔

اولڈ بوائے صاحب کی طرح ہم بھی یقین رکھتے ہیں کہ والدین کی اطاعت کو
حکیم نے ضروری قرار دیا ہے ۔ اور جو آیت آپ نے پیش کی ہے اس پر ہم
شیخ الہند آپ سے کم ایمان نہیں رکھتے اور جو صحیح بخاری کی حدیث یاد

...گیری کی فروع آپ نے درج کی ہیں ان سب کو بھی ہم آپ کی طرح مانتے ہیں، اگر آپ
نے عالمگیری کی بعض دوسری فروع پر نظر نہیں ڈالی، لیکن گفتگو صرف اس میں ہے کہ اگر
والدین ایک فرض عین کے ادا کرنے سے روکیں یا ایک محرم کے ارتکاب کا حکم دیں تو
کیا اس میں بھی اولاد والدین کی اطاعت اور خوشنودی حاصل کرنے پر مجبور رہے
جس قرآن نے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اسی نے
یہ بھی فرمایا ہے کہ

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا

اور اگر وہ دونوں تجھ کو اس پر مجبور کریں کہ تو اس چیز کو میرا شریک ٹھیرائے جس کا تجھے کوئی علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت مت کر البتہ دنیا میں ان کے ساتھ معقول طریقہ سے رہ۔

اس سے علماء نے یہ کلیہ معلوم کیا کہ خدا کی معصیت میں والدین کی اطاعت نہیں
کیونکہ خدا کا حق والدین کے حق سے مقدم ہے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ
...اگر سرکاری تعلیم گاہوں سے طلبہ کا علیحدہ ہونا اس ترک موالات میں داخل ہے
جس کو خدا نے فرض قرار دیا ہے تو اس میں طلبہ اسی طرح اپنے والدین کی اجازت کے
محتاج نہیں جس طرح نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں۔ اور جس جگہ جہاد میں اذن
والدین کو شرط بتلایا ہے وہ اس وقت ہے جبکہ جہاد فرض علی الکفایہ ہو۔ اگر فرض عین
ہو جائے تو اس وقت ابھی اذن شرط نہیں۔ اسی بنا پر حضرت شیخ الہند نے ترکِ
موالات کو اجازت والدین پر موقوف نہیں رکھا مگر اُس کی تبلیغ میں حقوق والدین
کی رعایت فرمائی ہے کیونکہ ترک موالات کی طرح اس کی تبلیغ فرض عین نہیں۔ بلکہ
فرض علی الکفایہ ہے۔

...والے صاحب کو اسی میں کلام کرنا چاہیے تھا کہ تعلیم گاہوں کی مقاطعت

ترک موالات کے تحت میں داخل ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر آپ کی سب تطویل لاطائل ہوگی۔

اور اگر بجائے صاحب کو واضح ہو کہ آیت قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاؤُکُمْ وَاَبْنَاؤُکُمْ الآیۃ حضرت مولانا نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی بلکہ جو ضعیف القلب غیر والدین کی نافرمانی یا اُن کے انقطاع کا تصور باندھ کر متوحش ہوتے تھے ان کی ہمت کو قوی کرنے کے لیے یہ آیت لکھی گئی ہے۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ ایک فرض عین کے انجام دینے میں ماں باپ یا کسی قریب سے قریب رشتہ دار کی خفگی سے ملول نہیں ہونا چاہیے۔

آخر میں مجھے اس قدر اور عرض کرنا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے مظالم مسلمانوں پر انگریزوں سے کم نہیں اور وہ آرہ شاہ آباد کٹار پور وغیرہ کے دردناک واقعات کو یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترک موالات نصاریٰ کی طرح ہندوؤں سے بھی ہونا چاہیے کیونکہ وہ بھی قَاتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ میں داخل ہے۔

اس خیال کی صحت کو ایک حد تک میں تسلیم کرتا ہوں لیکن اس قدر گزارش ہے کہ کٹارپور وغیرہ کے تلخ واقعات کے بعد ہندوؤں کے ممتاز لیڈروں اور قوم نے یہ عہد کیا ہے کہ آئندہ اس طرح کے واقعات کو ناممکن بنانے میں پوری پوری کوشش کی جائے گی۔ اس لیے جب پچھلی کارروائیوں پر اظہار تاسف کرکے انہوں نے ہماری طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور تحفظ خلافت کے اہم معاملہ میں ان کی مصالحت سے ہمیں ایک بڑی تائید حاصل ہوتی تو ہماری قوم کے بہت سے افراد اور اعلام نے بھی ان کے ساتھ مصالحت اور رواداری کی روش اختیار کرلی اور بہتر و اقساط سے پیش آنے میں حرج نہیں سمجھا کیونکہ قرآن شریف میں ہے

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَکَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ اگر وہ مصالحت کے لیے جھکیں تو تم کو جھک جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔

اور یہ خیال کہ ہندو ہم کو اس مصالحت کے پیرایہ میں دھوکہ دیں گے
اگرچہ ممکن ہے درست ہو جاتے مگر جب تک اُن کا کوئی فریب اور بدعہدی
ثابت نہ ہو یہ احتمال نکالنا اس قوم کی پوزیشن پر ایک حملہ ہے جیسے وہ آپ پر بھی
لا سکتے ہیں۔ بہرحال ہم کو حق تعالےٰ کی اس قسم کی تسلّی آمیز ہدایات پر اطمینان
رکھنا چاہیے کہ۔

وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ	اور اگر وہ لوگ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو
فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ	خدا تمھارے لیے کافی ہے۔

اگر کہا جائے انگریزوں سے مصالحت اور موافقت کرنے میں پھر کیا چیز مانع
ہے تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ قوم فی الحال مسلمانوں کی جماعتوں سے عراق وغیرہ میں برسرپیکار
ہے۔ اور مسلم اقوام کی آزادی کا خون کرتے ہیں۔ اس کی تلوار اس وقت بھی بلا دریغ
چل رہی ہے اس وقت تک اس سے مسلمان قوم نے قواعد اسلام کے موافق
کوئی جائز صلح نہیں کی۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کی موافقت اُس سے کس طرح
ممکن ہے۔

مسلمان بیشک اُس سے مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔
بشرطیکہ وہ اپنی حمتی عہد کے موافق خلافت اسلامیہ اور اُن مقامات مغضوبہ سے
ہاتھ اٹھالے جن کے زوال کی حسرت ناک داستان آج مسلمانوں کو خون کے آنسو
رلا رہی ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ میری اس تقریر سے آپ اُس فرق پر متنبہ ہو جائیں گے
جو قرآن و سنت اور فقہائے کرام نے ایک کافر محارب اور کافر مسلم کی حیثیات
میں ملحوظ رکھا ہے، اور بعض مفسرین سلف کے اس قول کی طرف بھی کریں گے جس
میں انھوں نے لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ کا مصداق

ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا؟

چند ماہ ہوئے تقسیم ہند کے بعد پہلی مرتبہ مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا۔ میں دہلی، لکھنؤ، خیرآباد جو میرا وطن ہے۔ کئی مقامات پر گیا۔

چشم تماشا نے بہت کچھ دیکھا لیکن —
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

روتی ہوئی آنکھوں اور تڑپتے ہوئے دل کے ساتھ جب دلی پہنچا تو قلب و دماغ کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ تحصیل علم کے سلسلے میں پانچ سال مسلسل مجھے دلی میں رہنے کا اتفاق ہوا، وہاں کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میرے لیے غیر معمولی کشش اور جاذبیت رکھتا تھا لیکن اب؟ اب وہاں کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا تھا:

بھاگ مسافر بھاگ مسافر میرے وطن سے بھاگ!

دلی کی رونق اور آبادی میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ تجارتی اور صنعتی اعتبار سے بھی وہ ترقی پر ہے۔ سارے ہندوستان کا دل پہلے بھی تھا اب بھی ہے۔

یہاں پہنچا تو تاریخ نے اپنے اوراق الٹنے شروع کر دیے۔

یہی شہر ہے، جہاں قطب الدین ایبک نے اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کا بنایا ہوا قطب مینار اب بھی اپنی پوری عظمت اور رفعت کے ساتھ موجود ہے اس کی مسجد قوت اسلام کی بنیاد ابھی تک قائم ہے، تاریخ کے ورق الٹتے رہے، پھر یہاں کی سرزمین پر علاؤ الدین خلجی یا صد ہزاراں جاہ و حشم تخت حکومت

دشمن نظر آیا یہ اپنے وقت کا سکندر تھا، نہیں یہ سکندر سے بڑھ کر تھا اس سے بڑھ کر یہ چلا فاتح شاید ہی دنیا میں کوئی ہوا ہو، یہ الٰہ آباد سے اُٹھا اور بجلی کی طرح کوندتا اور طوفان کی طرح بڑھتا، جنگلوں کو روندتا، پہاڑوں کو پھلانگتا دریاؤں کو عبور کرتا، فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے جنوبی ہند پہنچ گیا۔ یہ تو عہدِ شہزادگی کا واقعہ ہے۔ دہلی کا تخت اس کا انتظار کر رہا تھا، یہ آیا اور بیٹھ گیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ظالم ظلم نہیں کر سکتا تھا، زر اندوز ناجائز نفع نہیں کما سکتا تھا، اس کی ہیبت سے زمین و آسمان کانپتے تھے، اس کی بارگاہ میں آنے کے بعد کوئی خطا کار بچ نہیں سکتا تھا۔ خضر خاں اس کا بیٹا تھا جس نے راجکماری دیول دیوی پر عاشق ہو کر اس سے شادی کی تھی۔ اب دنیا میں نہ خضر خاں ہے نہ دیول دیوی، لیکن امیر خسرو کی لکھی ہوئی غیر فانی مثنوی خضر خاں و دیول دیوی اب تک موجود ہے۔ اور جب تک فارسی زبان زندہ ہے موجود رہے گی۔

تاریخ کے اوراق الٹتے رہے، دشمنوں کی دراندازیوں نے خضر خاں کو باپ کا معتوب بنا کر گوالیار کے قلعہ میں قید کرا دیا، پھر علاؤ الدین بیمار پڑا اور مر گیا۔ تختِ حکومت اُس کے نالائق بیٹے قطب الدین خلجی کے ہاتھ آیا جسے اُس کے نومسلم محبوب خسرو خاں نے جو درحقیقت دل سے ہندو ہی تھا قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا، اس کے نام کا کھوٹا سکہ چلنے لگا، قریب تھا کہ مسلم حکومت کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ جائے کہ غیاث الدین تغلق نمودار ہوا، اس نے اپنے آقا قطب الدین خلجی کا انتقام نمک حرام خسرو خاں سے لیا اور اُسے قتل کر ڈالا لیکن خسرو خاں نے خلجی خاندان کے ہر متنفس کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ کسی حریف کا اندیشہ ہی باقی نہ رہے، آخر تختِ حکومت غیاث الدین تغلق کو پیش کیا گیا اور اس نے قبول کر لیا، اس نے دبدبہ اور طنطنہ سے حکومت کی، زعمِ حکومت میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے ٹکرا گیا، بنگال کی مہم سر کر کے آ رہا تھا کہ اپنے بیٹے محمد تغلق کو حکم دیا، خواجہ صاحب سے کہہ دو، میرے

ہندوؤں کے ہاتھ میں آگئی!

مسلمانوں کا دورِ حکومت مطلق العنانی کا دور تھا، شخصی حکومت کا دور تھا، کوئی آئین نہ دستور، بادشاہ کی مرضی قانون، بادشاہ کی مرضی دستور، بادشاہ کی مرضی فرمان!

اور ان مسلمان بادشاہوں میں سب طرح کے لوگ تھے، سخت گیر اور درشت خو بھی، جیسے تغلق اور خلجی، مرنجاں مرنج بھی، جیسے جہانگیر اور شاہجہان کٹر قسم کے مذہبی بھی، جیسے فیروز شاہ تغلق اور عالمگیر ان مسلمان بادشاہوں کو، ہندو راجاؤں سے، ہندو حکمرانوں سے، ہندو طاقتوں سے لڑنا پڑا، لیکن ان میں سے کسی نے بھی۔ اور سر جادو ناتھ سرکار کا بیان ہے اورنگ زیب عالمگیر نے بھی ہندوؤں پر ظلم نہیں کیا، ہندو عوام کو ہدفِ ستم نہیں بنایا، ان کے مذہبی معاملات میں۔ ستی کی رسم کے سوا وہ بھی بزورِ شمشیر نہیں افہام و تفہیم کے ذریعہ مداخلت نہیں کی، ان کے معابد کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا، انہیں کسی جائز شکایت کا موقع نہیں دیا۔ انہیں بڑے بڑے عہدے دیے، محکمہ مال ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہا، حد یہ ہے کہ محکمہ دفاع تک پر ان کا تسلط اور تصرف رہا، افغانستان کی گورنری تک پر وہ مامور کیے گئے، انہوں نے رواداری کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

لیکن آج؟

آج مطلق العنان حکومت نہیں ہے، سارے رجواڑے اور والیانِ ریاست ختم ہو چکے ہیں، اب وہاں جمہوری حکومت ہے، آئینی اور دستوری حکومت ہے، اور یہ حکومت سیکولر بھی ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

اس سیکولر اور جمہوری حکومت کے دور میں گجرات کے ہلاکو — سردار پٹیل۔

کی زیر نگرانی مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور اس سیکولر اور جمہوری حکومت کے زیر سایہ مسلمان کس پرسی اور بیچارگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ملازمت کے دروازے بند تجارت کی بہر قسم مفقود، اردو خارج البلد، متعدد درگاہوں اور مسجدوں پر غیر مسلموں کا قبضہ دلی کے حالات سے باقی ہندوستان کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قیاسی گلستان من بہار مرا

(اگست ۱۹۶۱ء)

کوچۂ چیلاں میں محمد علی کا دفتر

ہندوستان کا دارالحکومت جب کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو محمد علی بھی دہلی آ گئے اور "کامریڈ" اور "ہمدرد" کی اشاعت یہیں سے شروع ہو گئی۔

محمد علی کی قومی زندگی کا آغاز بے شک کلکتہ سے ہوا لیکن اس کی زندگی کی بہار و خزاں دہلی کے حصہ میں آئی یہیں ان کی قیادت بام عروج پر پہنچی اور یہیں اس نے ادبار و انحطاط کی منزلیں طے کیں۔

عروج ہوا تو اس شان سے کہ چشم فلک بھی حیرت سے یہ منظر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ حق گوئی، حق نگاری اور حق پرستی کے جرم میں وہ مہرولی (قطب صاحب) میں نظر بند کر دیے گئے پھر چھندواڑہ بھیج دیے گئے کیونکہ دہلی کے مسلمان جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ دہلی اور مہرولی کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ حکومت کو یہ بات گراں گزری اور اس نے ایک دور و دراز اور مست مئے غفلت شہر میں بھیج دیا لیکن چھندواڑہ بھی بہت جلد محمد علی کا پرستار بن گیا۔ یہاں بھی لوگ اُن کی خدمت میں محبت کا نذرانہ لے کر آنے لگے۔ آخر تنگ آ کر حکومت نے بیتول جیل میں انہیں قید کر دیا۔ اسی نظر بندی کے بارے میں کہتے ہیں :

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

ایک اور غزل میں بڑے لطف انداز میں نظر بندی کا ذکر کیا ہے :

مستحق دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

چھ سال کی نظر بندی اور قید کاٹ کر رہا ہوئے۔ امرت سر میں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا حادثۂ قیامت خیز ابھی ابھی گزرا تھا۔ سیدھے امرت سر پہنچے اور کانگریس کے تن بے جان میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ علامہ اقبال کے شاگرد، معتمد، اور رفیقِ بزم و خلوت سید نذیر نیازی نے (جو جامعہ میں میرے استاد رہ چکے ہیں) برسبیلِ تذکرہ ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ علامہ اقبال کو جب محمد علی کی رہائی کی خبر ملی تو گو ان کا سیاسی مسلک دوسرا تھا لیکن وہ اپنے جذباتِ تحسین و آفریں ضبط نہ کر سکے۔ امرت سر آئے اور ٹاؤن ہال کے بھرے مجمع میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ محمد علی کو مخاطب کر کے وہ نظم پڑھی جو محمد علی ہی کے لیے موزوں کی تھی اور جو بانگِ درا میں اسیری کے عنوان کے عنوان سے موجود ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

آخری شعر ہے:

شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز شاہیں کردہ اند

محمد علی جب دہلی پہنچے تو سارا شہر ان کی دید و استقبال کو ٹوٹ پڑا۔ چاندنی چوک میں آزادی کا جہاز بنایا گیا۔ اہلِ شہر کی جانب سے خواجہ حسن نظامی نے سپاسنامہ پیش کیا۔ جواب میں محمد علی نے ایسی روح پرور اور وجد آفریں تقریر کی، غلامی کے خلاف اور آزادی کی حمایت میں ایسے ولولہ انگیز خیالات کا اظہار کیا برطانوی سامراج کی بنیادیں ہلا دیں اور ہندو مسلم اتحاد کی تائید میں ایسے اثر انگیز دلائل دیے کہ

سرکار پرست طبقہ دم بخود ہو کے رہ گیا۔ آزادی کے متوالے نئے جوش اور جذبہ کے ساتھ مصروفِ کار ہو گئے۔ اس نظربندی اور قید سے محمد علی جو سبق لے کر آئے وہ یہ تھا:

تعزیرِ عشق جرم ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

سزا کے بعد محمد علی کا "ذوقِ گنہ" یعنی سودائے آزادی بہت زیادہ بڑھ گیا اور کم تو کبھی نہ تھا، نہ جذبے کی کمی تھی، نہ ایثار اور قربانی کی۔ قاضی عبدالغفار برسوں تک ہمدرد کے سب ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

"نظربندی کے لیے مہر ولی جاتے وقت یہ دونوں بھائی اس طرح ہنس ہنس کر اور روفورِ مسرت سے بے خود ہو ہو کر دوستوں اور رفیقوں سے رخصت ہو رہے تھے جیسے نظربند ہونے نہیں کسی خوشی کی تقریب میں جا رہے ہیں!"

چند سال تک محمد علی ایک ہیرو کی طرح پوجتے رہے، پھر ان میں اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا اور یہ اختلاف سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا گیا۔ عوام محمد علی کو اپنے ساتھ چلانا چاہتے تھے۔ محمد علی کا خیال تھا کہ لیڈر وہ ہے جو عوام کو اپنا تابع رکھے، ان کی رہنمائی کرے، عوام تبلیغ اور تنظیم کی تحریکوں کے ساتھ تھے۔ محمد علی کانگریس اور تحریکِ آزادی سے وابستہ تھے۔ یہ حالت تھی کہ یہ جدھر سے نکل جاتے تھے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے لگتے تھے۔ زیارت کے لیے ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا۔ بیمار اور بوڑھے تک اس نادر موقع کو ہاتھ سے جانے دینا کسی طرح گوارا نہ کر سکتے اور یہ حال ہو گیا کہ اب جدھر سے نکلتے انگشت نمائی ہوتی، طنز کے تیر پھینکے جاتے فقرے کسے جاتے۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھنا اور نماز کے بعد مسلمانوں کے سامنے تقریر کرنا ان کے معمولات میں تھا۔ پہلے یہ تقریر گوشِ ہوش سے سنی جاتی، جوش و خروش

سے سنی جاتی اور اب بیچ بیچ میں مداخلت ہوتی اور اعتراض کیے جاتے، دل خراش اور درشت لہجہ میں محاسبہ کیا جاتا۔

حالات نے پھر پلٹا کھایا، محمد علی کا آفتابِ قیادت گہن سے نکل آیا جب انہیں یقین ہو گیا کہ کانگریس حقیقی معنی میں ایک ہندو جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کے کام نہیں آسکتی، تو اپنا یہ شعر پڑھتے ہوئے ایوانِ کانگریس سے باہر نکل آئے۔

یہاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یہاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

لیکن اب بہت سے نئے لیڈر پیدا ہو چکے تھے اور ان لیڈروں میں ہر ایک اپنے آپ کو قائدِ دوراں سمجھتا تھا۔ ان سے لڑنے کی محمد علی میں سکت نہیں رہ گئی تھی، وہ عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ذیابیطس نے ان کی صحت غارت کر کے رکھ دی تھی، اب کئی طرح کے نئے امراض بھی پیدا ہو چکے تھے۔ قلب کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی، ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ "دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا" لیکن اسی اثنا میں گول میز کانفرنس کا اعلان ہوا۔ دوستوں، رفیقوں اور ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود محمد علی نے اس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ گئے، بیمار گئے، بدحال، ایک معرکہ کی تقریر کی اور مر گئے، انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"یا تو میں یہاں سے آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں گا ورنہ تمہیں قبر کے لیے دو گز زمین مجھے دینی پڑے گی!"

آزادی کا پروانہ تو کیا ملتا دو گز زمین شاید مل جاتی، لیکن وہ اللہ کا سپاہی کفرستان میں کیوں سپردِ خاک ہوتا جب کہ نبیوں اور پیغمبروں کی سرزمین اس کے لیے آغوش وا کیے ہوئے تھی۔ اقبال نے محمد علی کا مرثیہ نہیں کہا ہے حقیقت بیان کی ہے۔

خاک قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
رفتہ زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

اس مرتبہ جب دلی گیا تو کوچہ چیلان کی وہ شاندار حویلی بھی دیکھی جہاں ہمدرد اور کامریڈ کا دفتر تھا اور ہندوستانی سیاست کا پیرو آن بان اور شان کے ساتھ قیام پذیر تھا، اب وہاں خاک اڑ رہی تھی، پھر قرول باغ کی اقبال منزل کا بھی نظارہ کیا، جس کا نام اب نرجا مے کیا ہے، یہ مکان عہد زوال میں محمد علی کا مسکن تھا۔

کانگریس اور حکومت ہند سے اگر کچھ اور ممکن نہ تھا تو کم از کم یہ تو ممکن تھا کہ کوچہ چیلان اور قرول باغ کے مکان پر ایک یادگاری تختی لگا دیتی۔ آخر محمد علی تحریک آزادی کا میر کارواں اور کانگریس کا صدر بھی رہ چکا تھا لیکن یہ میں نے کیا کہا؟ سنیے عالم بالا سے محمد علی کی آواز آرہی ہے، وہ کہہ رہا ہے ؎

طمع خاتمہ از خلق ندارم نیاز
عشق من از پس من خاتمہ خوانم باقیست

(اگست ۱۹۶۱ء)

"شریف منزل"، کا ویرانہ

۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران میں انگریزوں کے تسلط کے وقت اور تسلط مکمل ہونے کے بعد مسلمانوں کی حالت بہت زیادہ ابتر ہو گئی تھی۔ پورے پورے محلے زمین کے برابر کر دیے گئے تھے۔ بڑی بڑی عالی شان اور فلک رفعت عمارتیں کوڑیوں کے مول نیلام کر دی گئیں جاگیریں ضبط، زمینداریاں سوختہ، پنشن بند، القاب و خطابات منسوخ۔ دلی کی اس کیفیت کو مرزا غالب نے اپنے خطوط میں، داغ نے اپنے مشہور شہر آشوب میں اور ذکاء اللہ نے تاریخ ہند میں بڑے دردناک پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ حالات کسی قدر سنبھلے، شر انگیزی اور پابندیوں کے ساتھ مسلمانوں کو دھندے کی اجازت ملی۔ وہ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن کے اصول پر زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔

دلی میں ایک خاندان ایسا تھا جو زوال ناآشنا رہا۔ اس پر کسی طرح کی آنچ نہیں آئی۔ یہ شریف خانی خاندان تھا۔ اس خاندان کی سارے شہر پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس خاندان کے افراد نے نہ جانے کتنے لب گور لوگوں کو حیات نو عطا کی تھی۔ ہندو بھی اس کے نیاز مند تھے، سکھ بھی اور انگریز بھی۔ چنانچہ غدر کے زمانہ میں مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہی شریف منزل کی حفاظت کرتے رہے۔ غدر ختم ہونے کے بعد جب گرفتاری، خونریزی اور پھانسی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ مسلمانوں کے خلاف شروع ہوا تو وہ

کچھ چند ہی روز بعد دلّی میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہُوا۔ اس حادثہ کے وقت اجمل خاں کے نیاز مند، حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے لوگ، لیکن کیسی حیرت انگیز، کتنی عجیب اور کس قدر تحیّر خیز بات تھی کہ دلّی میں جب بقول جواہر لال (ملاحظہ ہو مولانا آزاد کی خود نوشت) کتّے بلّی کی طرح مسلمان قتل ہو رہے تھے، شریف منزل اتنی ہی غیر محفوظ تھی جتنا بلّی ماروں کا کوئی معمولی مکان۔ شریف منزل کے مکین اتنے ہی خطرے میں گھرے ہوئے تھے، جتنا دلی کا ایک عام مسلمان۔ نہ کوئی پہرہ نہ سنتری، نہ حفاظت کا سامان، نہ فوج کا دستہ ـــــ کتنا عجیب تھا یہ انقلاب بھی۔

میرے تغیر رنگ پرست جہاں!!
انقلابات ہیں زمانے کے!!

اس مرتبہ میں جو دلّی پہنچا، تو نہ جانے کیوں شریف منزل کے ویرانے پر بھی ایک نظر ڈال آیا۔

یہاں کبھی اجمل خاں کا دربار لگا کرتا تھا، مریضوں کی کثرت، عقیدت مندوں کا ہجوم، سیاسی لیڈروں کا انبوہ اور طالب امداد لوگوں کی افراط سے تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ مگر اب یہاں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ جیسے یہ ایک خرابہ ہے جہاں انسان کا گزر نہیں۔ اجمل خاں کے فرزند دلبند یہیں رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح جیسے کوئی گوشہ نشین سامنے کے کمرے میں حکیم ظفر خاں مطب کرتے تھے۔ ذہانت، حذاقت اور قابلیت ان پر ختم تھی۔ ہر وقت مریضوں کا جمگھٹ رہتا، مگر اب کمرہ بند تھا۔ اب یہاں کوئی مطب نہیں کرتا۔

اِدھر دوسری طرف کے حصہ میں "مسیح الملک ثانی" حکیم محمد احمد خاں مطب کیا کرتے تھے۔ محمد احمد خاں واقعی مسیح الملک ثانی تھے۔ ان کی حذاقت اور تشخیص و تجویز کا ہا

خود حکیم اجمل خاں مانتے تھے۔ متعدد والیان ریاست کے سرکاری طبیب تھے۔ لاکھوں کمایا اور لاکھوں اڑایا۔ مجھے انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر کا وہ خطبہ یاد ہے جو الہ آباد میں دیا گیا تھا اور جس میں انہوں نے برملا اعتراف کیا تھا کہ وہ دل کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ لکھنؤ، کلکتہ، پٹنہ، بمبئی اور مدراس کے میڈیکل کالجوں کے تجربے کار، جہاں دیدہ اور مانے ہوئے ڈاکٹروں کا علاج کیا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر مایوس ہو کر وائنا گئے، لندن پہنچے اور مایوس لوٹ آئے۔ اسی حالتِ مایوسی میں ایک دوست نے حکیم محمود خاں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ کئی بار کے اصرار کے بعد بے دلی کے ساتھ ایک مرتبہ پہنچے۔ حکیم صاحب نے حال سنا، نبض دیکھی، نسخہ لکھا۔ بہت سستا، روپے ڈیڑھ روپے کا، بے دلی کے ساتھ دوا شروع کی لیکن معجزانہ طور پر صحت ہونا شروع ہو گئی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد مرض کافور ہو گیا۔ جس مرض کے دورے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ اب کئی سال سے اس کا نام و نشان نہ تھا۔

یہ مطب بھی خالی تھا۔ یہاں بھی خاک اڑ رہی تھی۔ لاہور میں نسبت روڈ پر ایک مکان میں مہاجر کی حیثیت سے حکیم صاحب کے صاحبزادے قیام پذیر ہیں اور دواخانہ حکیم محمود خاں چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا حال دیکھ کر ان کے ماضی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

شریف منزل سے باہر نکلا تو نظر ہندوستانی دواخانے پر پڑی۔ کسی زمانے میں اس دواخانے کی آمدنی سے طبیہ کالج کا عظیم الشان اور نادر روزگار ادارہ اور اس کے متعلقات کے مصارف ادا کیے جاتے تھے۔ اجمل خاں نے اپنے تمام صدری اور خاندانی نسخے اس دواخانے کو دے دیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی صحت اثر دواؤں پر، لیکن اب دواخانے پر ہو کا عالم طاری تھا۔ دو تین لوگ بیٹھے تھے۔ نہ مریضوں کی قطار تھی نہ دوائیں طلب کرنے والوں کا ہجوم۔

جی سے لے کر ولبھ بھائی پٹیل تک اور شوکت علی سے لے کر شعیب قریشی تک سب پر تھے اور احسانات ایسے تھے جو اتارے نہیں جا سکتے! بھلا احسان بھی کبھی اتار لیا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب شروع میں انجمن خدام کعبہ کے سرگرم کارکن تھے، مجلس خلافت کے رکن رکین تھے۔ مسلم لیگ کے فعال اور کارگزار کارکن تھے، موتمر عالم اسلام کے زعیم کبیر تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ان سب سے ناتہ توڑ کر صرف کانگریس کے ہو رہے۔ اپنے مسلک کی بہت گراں قیمت انہیں ادا کرنی پڑی۔ دیرینہ کار، محبوب اور عزیز ساتھیوں سے اختلاف کرنا پڑا۔ محمد علی سے لڑائی ہوئی شوکت علی سے جنگ کی، شعیب قریشی سے تلخی اور بدمزگی تک نوبت پہنچی۔ عبدالرحمٰن صدیقی سے ان بن ہوئی لیکن انھوں نے جو راستہ اپنے لیے سوچ سمجھ کر متعین کر لیا تھا اس سے منہ نہ موڑا، زندگی کی آخری سانس تک غیر مشروط طور پر کانگریس کے وفادار رہے۔

ڈیرہ دون سے نواب رام پور کا علاج کر کے آ رہے تھے کہ ریل میں حرکت قلب بند ہو گئی اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری جو ان کے بھانجے بھی تھے اور ان کی اکلوتی لڑکی زہرہ کے شوہر بھی اپنے نامور خسر اور ماموں کے جانشین بن کر بیٹھے۔ ڈاکٹر شوکت اللہ لاکھ قابل اور ہشیار سہی، لیکن وہ تجربہ اور وہ مہارت کہاں سے لاتے جو مرحوم انصاری کا حصہ تھی!

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانوں کی گردنیں کٹنے لگیں، مکانات لٹنے اور جلنے لگے تو دارالسلام کی بھی شامت آ گئی۔ یہاں انجمن ترقی اردو ہند کا صدر دفتر تھا جس کے مستقل صدر سر تیج بہادر سپرو تھے یہ دفتر بھی لٹا، کتابیں بھی جلیں اور دارالسلام کو بھی یورش کے اثرات سے بچایا نہ جا سکا۔ شوکت اللہ اور زہرہ کو ہوٹل میں پناہ لینی پڑی۔ گاندھی جی نے اس حادثہ فاجعہ پر خون کے آنسو بہائے۔ لیکن جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔

جواہر لال بھی بے بس تھے اور گاندھی جی بھی۔ سردار پٹیل کی حکومت من مانی کر رہی تھی۔!

میں اُس کوٹھی کے دروازے پر جاکر کھڑا ہو گیا، بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ میری چشم تصور میں وہ زمانہ آگیا جب ڈاکٹر انصاری یہاں رہتے تھے اور ہندو مسلم لیڈروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے سنجیدہ چہرہ پر ایک جاں نواز تبسم کی شوخی ہمیشہ جھلکتی رہتی تھی۔ وہ مدبر بھی تھے، سیاست دان بھی۔ اور معالج بھی۔ ان کی بارگاہ میں نہ فرقہ کی قید تھی نہ ذات کی، نہ مذہب کی۔ وہ سب کا دکھ درد سنتے تھے، سب کی دلجوئی کرتے تھے، سب کے کام آتے تھے، سب کے غم میں حصہ لیتے تھے۔ ان کا یہ گھر آج دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ انقلابات ہیں زمانہ کے۔

یہاں سے آگے بڑھا اور اس عظیم عمارت کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا، جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا دفتر تھا۔ یہ گھر کسی زمانہ میں مسلمانان ہند کی امید گاہ تھا۔ یہاں قائد اعظم جلوہ افروز ہوتے تھے، یہاں لیاقت علی خاں آتے تھے، یہاں ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر آتا تھا۔ یہاں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا، یہاں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا، یہاں ملت اسلامیہ کے آزاد اور خود مختار وطن کی اسکیمیں بنتی تھیں، یہاں آزاد مسلمان قوم کے مستقبل کے منصوبے تیار ہوتے تھے، یہاں پاکستان کی تعمیر و تشکیل کے معاملات و مسائل زیر بحث آتے تھے۔ لیکن اب؟ وہاں مسلم لیگ کا کوئی نام بھی نہیں لے سکتا۔ اب وہاں ماضی کا ذکر جرم ہے۔

نئی دہلی کی خاک بھی میں نے چھانی۔ لیاقت علی خاں کی کوٹھی میں پاکستانی ہائی کمشنر کا دفتر ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالتا، نہ جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹتا پھرا۔ اس کوٹھی کے سامنے قدم خود بخود رک گئے جو ۱۰۔ اورنگ زیب روڈ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ قائد اعظم کی کوٹھی تھی۔ بڑے شوق اور بڑے جوش سے یہ کوٹھی انہوں نے خریدی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ایک مرتبہ یہاں حاضری دینے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ قائد اعظم اس وقت

تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کا ہندو مالی سبزۂ نورستہ کی نگہبانی میں مصروف تھا، اس سے بہت دیر تک باتیں کرتا اور قائد اعظم کے بارے میں دلچسپ اور حیرت انگیز معلومات حاصل کرتا رہا تھا!

یہ کوٹھی مسلمانانِ ہند کے شہریارِ بے تاج کی اقامت گاہ تھی۔ یہاں وہ دبلا پتلا اور نحیف و لاغر شخص رہتا تھا جس میں پہاڑوں سے ٹکرانے، طوفانوں سے لڑنے اور سمندر کی بپھری ہوئی سربفلک موجوں سے زور آزمائی کرنے کی طاقت تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے ذکر سے بکنگھم پیلس کے در و دیوار گونجتے تھے، جسے منانے کی تدبیریں ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن میں سوچی جاتی تھیں، جس کے نام سے ایوانِ وائسرائے میں زلزلہ آجاتا تھا، جس کا نام ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی اور منظم سیاسی جماعت کانگریس کے لیے لرزہ فگن تھا۔ وہی تھا جس نے بکھری ہوئی ریت کے ذروں کو دیوارِ آہن بنا دیا، جس نے ایک مردہ قوم کو زندگی کے حوصلے اور ولولے سے معمور کر دیا، جس نے ایک شکستہ حال اور مایوس قوم میں وہ امنگ اور ترنگ پیدا کی کہ وہ ملک کی ایک ناقابلِ مزاحمت قوت بن گئی۔ وہی تھا جو اس قوم کا سالارِ کارواں بن کر اسے اپنے ساتھ لیکر اسے خودی، خودشناسی اور خودنگری کے اسرار سے واقف کر کے بڑھا اور بڑھتا چلا گیا۔ اس نے ایک ایسی قوم کو جو سیاست کی دنیا میں ہیچ تھی ایک ایسے ملک کا مالک بنا دیا جو دنیا کی مسلم مملکتوں میں سب سے بڑی ہے۔ دنیا کی بڑی حکومت میں جس کا نمبر پانچواں ہے۔ کیا ایسے قائد کی اور ایسے ملک کی مثال مل سکتی ہے؟ کیا یہ سیاست کی دنیا کا سب سے بڑا معجزہ نہیں ہے؟

آج اس کوٹھی کے مالک سیٹھ ڈالمیا ہیں۔

بڑی دیر تک یہاں کھڑا رہا، آنکھوں سے قطراتِ اشک ٹپک رہے تھے۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن راضی نہیں ہوتا تھا کہ اس منزل کو چھوڑ کر آگے بڑھوں۔ آئے تھی یہی جی میں یہیں عمر بسر کر

(اگست ۱۹۶۱ء)

مولانا فضل حق خیرآبادی کی حویلی

مولانا فضل حق خیرآبادی یگانہ خصوصیات و ملکات اور فضائل و حسنات کے جامع تھے، وہ عربی زبان کے بلند پایہ اور صاحبِ طرز انشاپرداز و شاعر تھے، منطق اور فلسفہ کے امام تھے، دولت و ثروت اُن کے قدم چومتی تھی، شہرت پیچھے پیچھے چلتی تھی، وہ صاحبِ دل بھی تھے اور صاحبِ دماغ بھی، اہلِ قلم بھی اور اہلِ سیف بھی۔ اعزاز اور منصب کو اُن کی ذات پر فخر تھا، دولت و امارت اُن کے گھر کی لونڈی تھی بادشاہ ظفر اور واجد علی شاہ اختر کے عہد گرامی گہر میں وہ دربار اور ایوان کی زینت بھی بنے لیکن علم و فن سے انہیں جو لگاؤ تھا وہ بدستور قائم رہا، ان کی اصل جگہ ایوانِ حکومت میں نہ تھی، مجلسِ علم میں تھی، اُن کے پایہ فضل و کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کی لکھی ہوئی کتابیں مدارسِ عربیہ کے نصاب میں گزشتہ ایک سو برس سے شامل ہیں جن کی قدر و قیمت اور افادیت و معنویت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے

مولانا فضل حق کا وطن مالوف اودھ کا ایک مردم خیز قصبہ خیرآباد تھا — خیرآباد

جس کی زمین سے ہم مرتبہ پست آسماں کہا ہے!

یہ چھوٹی سی بستی علما، صلحا، اصفیا، و صوفیا، شعرا و ادبا، فضلا نے روزگار اور حکمائے ذی وقار کا مولد و منشا رہی ہے۔ مولانا فضل حق بھی اسی دوران کے اعلیٰ شب چراغ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی عام طور پر غدر کے نام سے مشہور ہے لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ

کچھ اور ہوتی اس تحریک میں مولانا نے بھی حصہ لیا، ماخوذ ہوئے اور حاکم مجاز کے سامنے پیش ہوئے۔ بچاؤ کی بہت سی صورتیں تھیں، وسائل و ذرائع بھی تھے، سعی و سفارش کے امکانات بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس انگریز کی عدالت میں مقدمہ پیش تھا وہ مولانا کی شخصیت سے بے حد متاثر تھا اور اس پر تیار تھا کہ اگر مولانا جرم سے انکار کر دیں تو وہ کاغذات داخل دفتر کر کے پروانہ رہائی صادر کر دے گا، لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے فرمایا، رہائی حاصل کر کے توشۂ آخرت سے محروم ہونا مجھے گوارا نہیں۔ اس جواب کے بعد رہائی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ساری املاک و جائداد ضبط کر لی گئی اور حبس دوام بعبور دریائے شور کے نفاذ کا فرمان صادر ہو گیا۔ مولانا انڈمان بھیج دیے گئے۔ املاک و جائداد سرکاری تحویل میں آ گئی۔ انڈمان کے دور اسیری ہی میں مولانا کے خامۂ حقیقت رقم سے اَلثَّورَۃُ الْہِندِیَّہ کے نام سے وہ موتی نکلے جو اردو ادب انشا کی تاریخ میں زندۂ جاوید بن چکے ہیں۔

خیرآباد میں مولانا نے ایک نہایت شاندار اور رفیع المنزلت حویلی تعمیر کرائی تھی۔ یہ سنگ سرخ کی ایک مستحکم اور خوش نما عمارت تھی جو رعنائی تعمیر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ بہت بڑا پھاٹک۔ جن میں سے بیک وقت دو ہاتھی گزر سکتے تھے۔ آگے بڑھیے تو ایک وسیع دالان بیچ میں ایک خوبصورت فوارہ دائیں بائیں خوشنما برآمدے سنگ مرمر کی ایک نہایت سبک اور نظر فریب بارہ دری۔ ان راہوں کو طے کر کے آگے بڑھیے تو زنان خانہ اپنی وسعت اور کشادگی میں ایک چھوٹا سا محل۔ پھر بائیں باغ۔ اس حویلی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی امیر کبیر کا کوشک ہے اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ مولانا جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں تجارت و کاروبار سے بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ سر سید نے آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں ایسے والہانہ طرز پر مولانا کا ذکر کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جہانگیر کے دربار میں عرفی اپنا

نصیدہ پڑ رہا ہے۔

مولانا کی حویلی جس محلہ میں واقع تھی یہ ارباب شریعت اور اصحاب طریقت کا مسکن تھا۔ چند قدم کے فاصلہ پر حضرت بڑے مخدوم صاحب کا مزار پُرانوار ہے حویلی سے کھارے کنویں کی طرف بڑھیے تو ذرا سی مسافت پر عہد آخر کے صوفی صافی مقبول میاں کا آستانہ ہے۔

میں نے شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد جب حویلی دیکھی تو اُس کی حیثیت ایک ویرانہ سے زیادہ نہ تھی۔ جنبلی کے بعد حکومت نے صلہ وفا کے طور پر اسے ایک غیر مسلم تعلقدار راجہ صاحب کمال پور — آزادی ہند کے بعد کمال پور کملا پور بن گیا ہے — کو بخش دیا۔

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس حویلی میں واقعی سمرقند و بخارا کا علم آکر جمع ہو گیا تھا۔

یہ حویلی جو آج ایک ویرانہ نظر آ رہی تھی کبھی علم و فضل کا مرکز تھی، یہاں سے علم کے سوتے پھوٹتے تھے۔ یہاں علم کی روشنی سے تاریکی نور بن جاتی تھی۔ دور دور سے مختلف دیار و امصار سے تشنہ گان علم آتے تھے اور سیراب ہو کر جاتے تھے یہ حویلی نہ تھی علم کا سرچشمہ تھا اور

بر کجا بود چشمۂ شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آئند!

اور اب یہ حویلی ایک ہندو تعلقدار کی ملکیت تھی، جسے اُس کے رکھ رکھاؤ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جس کے نزدیک یہ صرف خاک کا ایک ڈھیر تھی، جس کے پتھر قیمتی تھے لیکن ان پتھروں سے بھی پائندہ تر نقوش جو قدم قدم پر بکھرے ہوئے تھے، کوئی قیمت نہ رکھتے تھے، کسی اہمیت کے حامل نہ تھے۔ کبھی یہاں روم و شام، شیراز و

اصفہان ماوراء النہر اور ترکستان کے طالبانِ علم جوق در جوق موج در موج آیا کرتے تھے۔

یہاں کے بام و در حکمت و معرفت کی صداؤں سے گونجا کرتے تھے۔ یہ محض ایک گل کدہ نہ تھا، جنابانِ علم و فن تھا۔ یہ بارہ دری، یہ برآمدے، یہ کمرے، یہ ایوان، یہ دالان در دالان یہ صحنچیاں، یہ ڈیرے، جہاں اصحاب فضل و کمال کے قافلے اترا کرتے تھے جہاں ارباب فن و ہنر کے بل حاضر ہوتے تھے، جہاں وقت کے امراء اور حکام سر جھکا کر آستاں بوسی کیا کرتے تھے، جہاں علم کا دربار لگتا تھا، حکمت کی گرہ کشائیاں ہوتی تھیں، اجتہاد و تحقیق کے مرحلے طے ہوتے تھے۔ اب وہاں ویرانی تھی، سناٹا تھا، سکوت مرگ تھا۔ باغی کالے پانی بھیج دیا گیا اور وہیں عالم قید میں سفر آخرت کر گیا۔ اس کی اولاد اِدھر اُدھر بکھر گئی اور اس کا مکان عالی شان ویرانہ بن گیا۔

گلشن میں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

پھر کمال پور کے راجہ سورج بخش سنگھ کو اپنے محل کی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تعلقدار ہونے کے باوجود آدمی جزرس تھے بے ساختہ ان کی نظر مولانا کی حویلی پر گئی اس حویلی کے پتھر، یہاں کی لکڑیاں کا غذی وہ بنتیں اب بھی کام آسکتی تھیں اور یہ سب چیزیں انہیں کی تھیں کیونکہ ان کے ریجواڑے کو حکومت نے جو چیزیں انعام کے طور پر عطا فرمائی تھیں اُن میں یہ حویلی بھی تھی۔

فوراً فرمان صادر ہُوا اور مولانا فضل حق کی حویلی کدالوں اور پھاوڑوں کی زد میں آگئی۔ یہ چھت اتری وہ دیوار گری یہ پھاٹک اُکھڑا۔

ایک محل ڈھے گیا۔

دوسرا محل تعمیر ہو گیا۔

مسلمانوں نے حسی طاری تھی، کسی نے صدائے احتجاج بھی بلند نہ کی ور وقت اِنی

ہے یہ مسئلہ صوبائی کونسل میں اُٹھایا جا سکتا تھا اور محکمہ آثار قدیمہ مجبور کیا جا سکتا تھا کہ اپنی تحویل میں لے کر اُس کی نگہبانی کا فریضہ انجام دے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں آخری مرتبہ میرا خیرآباد جانا ہوا اُس وقت تک اُس حویلی کے کچھ کچھ آثار اور نقوش باقی تھے۔ کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ یہ ویرانہ کبھی رشک چمن رہ چکا تھا۔ مٹی مٹی سی سہی ایک یادگار باقی تھی لیکن زمانہ کی گردش اسے بھی نہ دیکھ سکی۔ اب وہ اکھڑے کھڑے اور مٹے مٹے سے نشان بھی باقی نہیں رہ گئے تھے۔

نومبر ۱۹۶۰ء میں ایک مرتبہ پھر خیرآباد جانے کا جی چاہا۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد کے لیے ایک ایک ہفتہ رکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق سب سے آخر میں خیرآباد کا نمبر آیا۔ لکھنؤ سے صبح نو بجے روانہ ہوا گیارہ بجے پہنچ گیا۔ اپنے عزیز اور دوست سید نجم الحسن صاحب کے یہاں مہمان بنا، تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر اپنے خاندانی قبرستان (حظیرہ میں) فاتحہ پڑھنے گیا وہاں سے مولانا فضل حق کی حویلی کی طرف گیا لیکن اب وہاں خاک اُڑ رہی تھی جیسے صدیوں سے یہ مقام دشت و بیابان کا ایک حصہ چلا آ رہا ہے۔ سامنے حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ کا گنبد نظر آ رہا تھا وہیں سے کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ کر واپس چلا آیا۔ طبیعت اتنی بے کل ہوئی کہ پھر ایک لمحہ بھی ٹھہرنے کا جی نہ چاہا۔ افتاں و خیزاں اسٹیشن پہنچا اور لکھنؤ واپس آ گیا۔ چھوٹے ویرانے سے ایک بڑے ویرانے میں! ہا! یہ ہے دنیا!

مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

صنم خانۂ قلب و نظر

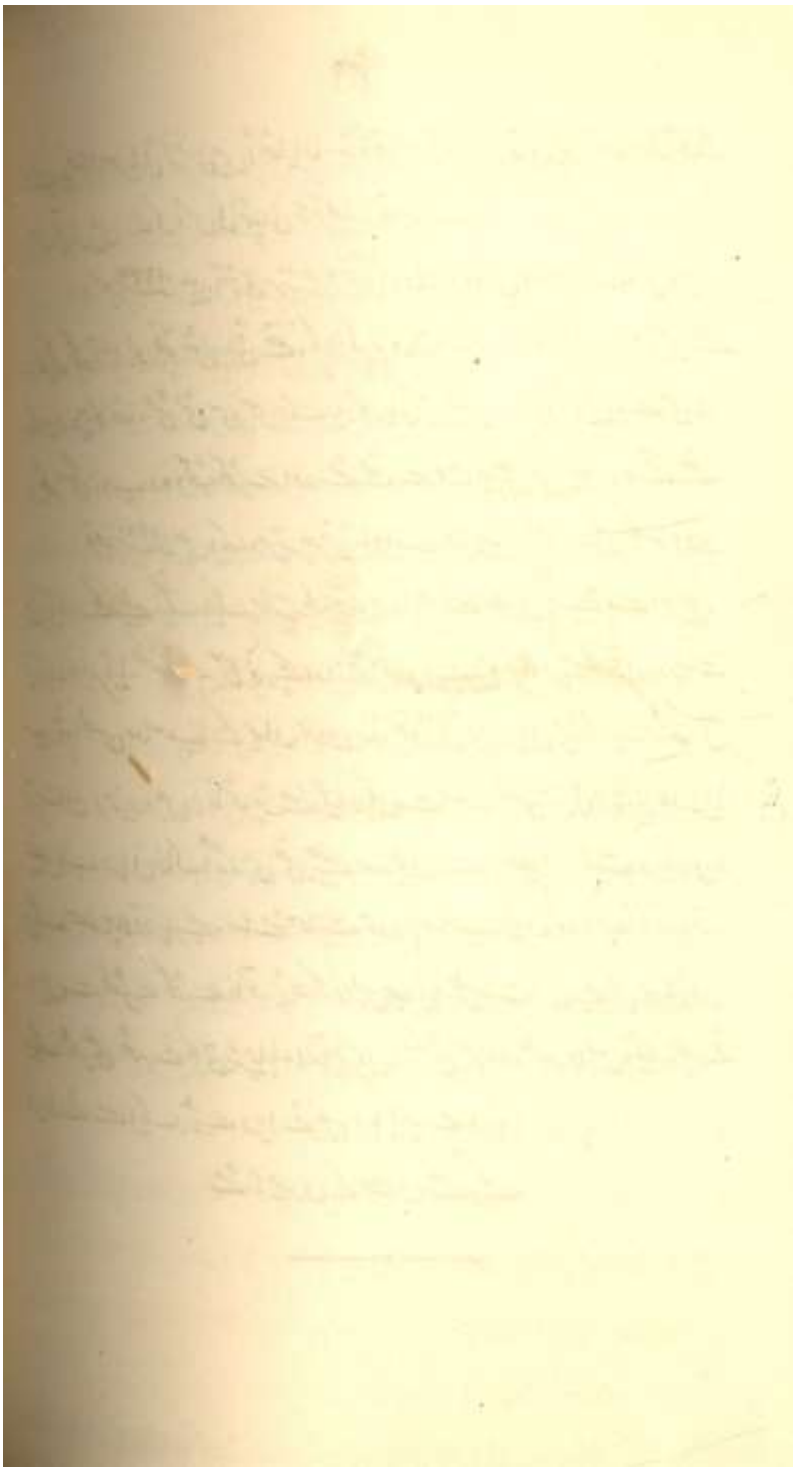

مقبول میاں!

قرۃ العین حیدر کا ایک "افسانہ"!

قرۃ العین حیدر نے، اپنی کتاب "میرے بھی صنم خانہ" میں بڑے طنز، اور مضحکہ کے ساتھ مقبول میاں کا ذکر کیا ہے، اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عورتوں کو خاص طور پر باریاب کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ میں قرۃ العین کی افسانہ نگاری کا قائل ہو سکوں یا نہ ہو سکوں، یہ ایک الگ بات ہے، لیکن ان کی افسانہ گوئی کا مجھے قائل ہو جانا پڑا۔

مقبول میاں خیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ ایک مشہور بزرگ خاندان کے فرد ہیں، ذات کے سید ہیں، اجمیر اور دوسرے مقامات پر علوم عربیہ کی باقاعدہ تحصیل کی، اور سند فروغ حاصل کی، اچھے خاصے کھاتے پیتے زمیندار گھر کے مالک ہیں تکمیل تعلیم کے بعد، وقت کا بڑا حصہ، عبادت اور ریاضت میں صرف کرنے لگے رفتہ رفتہ جذب کی کیفیت طاری ہوئی، اور اب تک اسی عالم میں ہیں، صرف مسلمان ہی نہیں، اطراف و جوانب کے ہندو تک، ان کے سامنے عقیدت سے سر جھکاتے ہیں، حصول سعادت و برکت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، اور کامیاب و کامران واپس جاتے ہیں!

مقبول میاں، نہ پیشہ ور فقیر ہیں، نہ مصنوعی بزرگ، ان پر ایک کیفیت

طاری ہے، خوش عقیدہ لوگ اسے جذب سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ اسے جنون کہہ لیجیے، لیکن ان کا یہ جنون ابھی کتنا اچھا ہے کہ وہ کسی کو پریشان نہیں کرتے، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، لوگ آتے ہیں اور دامنِ امید، گوہرِ مراد سے بھر کر واپس ہوتے ہیں، مرد، عورت، بوڑھے، بچے، کمزور، بیمار سب ان کے پاس آتے ہیں، وہ کسی سے نذرانہ نہیں لیتے، غریب پر امیر کو ترجیح نہیں دیتے۔ ان کے دربار میں بڑے بڑے کلکٹر، اور کمشنر، زمیندار، اور تعلقہ دار، سرمایہ دار اور مزدور ہر قسم اور طبقہ کے لوگ آتے ہیں، اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوتا ہے، بات پوچھی، مختصر الفاظ میں جواب دیا، اور رخصت کر دیا، نہ آؤ بھگت، نہ تعظیم تکریم، نہ استقبال، نہ خوش آمدید، نہ نشست برخاست کا انتظام، جہاں وہ لوگوں سے ملتے ہیں وہاں نہ کوئی مسند ہے، نہ تخت، نہ دری، نہ کرسی، نہ میز، نہ چارپائی، نہ اسٹول، نہ بنچ، خود کھڑے رہتے ہیں، دوسروں کو کھڑا رکھتے ہیں، کھڑے کھڑے بات کرتے ہیں اور رخصت کر دیتے ہیں۔

ان کے گاؤں سے گاڑیاں بھر بھر کر اناج آتا ہے، ان کی اگر نظر پڑ جاتی ہے، تو ان گاڑیوں کو اپنے سامنے کھڑے غریبوں اور محتاجوں میں لٹا دیتے ہیں، گھر میں فاقہ ہو تو ہو، لیکن یہ پھر ایک دانہ بھی گھر میں نہیں جانے دیں گے، ان کی نشست گاہ پہلے کمزور تھی، پھر منہدم ہوئی، اب تقریباً زمین کے برابر ہے، بڑے بڑے رجواڑوں سے بار بار اصرار استدعا ہوئی کہ اس کی تعمیر کرا دی جائے، لیکن ان کی "نہیں" کو "ہاں" سے کوئی نہیں بدل سکا، ان کے پاس کچھ نہیں ہے، نہ اپنے بیوی بچوں کے لیے، انھوں نے کچھ باقی رکھا، زیور تک، غریبوں اور محتاجوں کو دے دیے، کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے، کوئی کچھ خدمت کرنا چاہے، تو اس سے ناراض ہو جاتے ہیں، مرغ اور گوشت سے نفرت کرتے ہیں، پراٹھے اور شیرمال کی طرف دیکھتے بھی نہیں شاہی ٹکڑے اور فیرنی کی صورت بھی نہیں دیکھتے، دال دلیا کھاتے ہیں، وہ بھی کبھی

کھایا کبھی نہیں،

سال میں صرف تین مرتبہ، گھر سے باہر نکلتے ہیں، عید کے موقع پر، بقر عید کے موقعہ پر، اور عرس کے موقع پر، باقی سارا سال اپنے ویرانے میں گزار دیتے ہیں، نئے کپڑے نہیں پہنتے، میرا خیال ہے، عید ہی پر، نہایت سادہ نیا جوڑا پہنتے ہیں، پھر وہی سال بھر تک چلاتے ہیں، عرس کے موقع پر قوالی بھی ہوتی ہے، اور نذر پیش کرنے کا یہ بہترین موقع ہوتا ہے، نوٹوں کی بارش ہونے لگتی ہے، اس نذر کو، کبھی ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے ہیں، کبھی قوالوں کو دے دیتے ہیں، کبھی حاضرین مجلس میں سے کسی غریب آدمی کو عطا کر دیتے ہیں۔

سب سے بڑا بزرگ وہ ہے جسے سب سے پہلے اس کے گھر والے، پھر محلے والے، پھر شہر والے بزرگ مانیں، ان کی بزرگی کا یہ عالم ہے کہ گھر والے ان پر جان چھڑکتے ہیں، محلے والے ان کے نام پر مر مٹنا باعث سعادت سمجھتے ہیں، شہر والے ان کے ایک اشارہ پر اپنی گردن خود کاٹ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب جانتے ہیں، مقبول میاں، بزرگ ہوں، یا نہ ہوں، لیکن بہت بڑے آدمی بھی ہیں، جو کسی کے سامنے دست سوال نہ دراز کرتا ہو، جو کسی کو نظر بھر کر نہ دیکھتا ہو، جو غریبوں اور محتاجوں کے کام کرتا ہو، جو سب کے لیے دعائے خیر کرتا ہو، جو مصیبت زدوں کے کام آتا ہو، جو فاقہ مستوں کو اپنی نان جویں بخش دیتا ہو، جو ضرورت مندوں کو، سردی کے زمانہ میں، اپنی آخری پونجی، ـــــ کمبل ـــ تک بے تامل بخش دیتا ہو، اگر وہ بڑا انسان نہیں ہو سکتا، تو کیا وہ قرۃ العین کے صنم خانے، میں سے، تلاش کیا جائے گا،!؟

میرا سارا گھر، مقبول میاں کا عقیدت مند ہے، میں عقیدت کے معاملہ میں بڑا بخیل واقع ہوا ہوں، آسانی سے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا، لیکن مقبول میاں کو

میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں، اور میں نے ان میں سوا بزرگی کے کچھ نہیں پایا۔

میں جب بچہ تھا، تو دیکھتا تھا وہ بچوں کو بتاشے اور پیسے بے دریغ بانٹتے ہیں، پھر بڑا ہوا تو دیکھا، کہ وہ کسی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتے، سب کے کام آتے ہیں، لیکن کسی کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کے کام آئے، میرے سامنے ان کی زندگی کی مسلسل تاریخ ہے، اور اس تاریخ کے دور میں تھوڑے تجربے کے بعد بہت سے بزرگوں سے مجھے اپنی عقیدت چھین لینی پڑی، لیکن مقبول میاں کی جھولی میں چند عقیدت کے ٹکڑے جو میں نے ڈالے تھے، وہ اب تک وہیں ہیں، ان میں ذرا سی جنبش تک بھی تو نہیں ہوتی۔!

مقبول میاں، لوگوں کو گنڈے نہیں دیتے، لوگوں کے لیے چلے نہیں کھینچتے لوگوں کے لیے "حزب البحر" کا ختم نہیں پڑھتے، سیدھی سی بات، یا دعا کر دی، یا دعا بتا دی، اللہ اللہ خیر صلاّ،

اس کردار، اور شخصیت کے لوگ مسلمانوں میں ہیں کہاں، کتنے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ، زور قلم میں احساس ذمہ داری سے یکسر، دستکش ہو کر ایسے بزرگ کی شان میں افسانہ طرازی کی جائے، لیکن افسانہ گو کی زبان کون روک سکا ہے! ؟

(مارچ ۵۶ء)

بن چکے ہیں۔ موجودہ حکومت افغانستان کا سب سے بڑا محسن آج خود اختیاری طور پر جلاوطن ہے۔ وطن کی محبت کسے نہیں ہوتی؟ لیکن وہ اب کسی طرح بھی وطن واپس جانے کو تیار نہیں ہے۔ افغانستان میں علماء کی جو درگت ہو رہی ہے اور روایات دینی کا جس طرح استخفاف ہو رہا ہے انگریزوں سے کہیں بڑے دشمن اسلام روس کا جس طرح عمل دخل بڑھ رہا ہے اسے ملا شور بازار کم از کم اپنی آنکھ سے دیکھنا نہیں چاہتے۔

انہی ملا شور بازار کے برادر بزرگ حضرت نور المشائخ تھے۔

حضرت نور المشائخ ایک بہت بڑے سلسلۂ طریقت کے سجادہ نشین تھے۔ جملہ فضل کے اعتبار سے یکتا، زہد و عبادت میں اپنی مثال آپ، غیرت دینی اور حمیت ملی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ اقدار اسلام کے احترام اور پاسداری میں وہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوت حتیٰ کہ اپنے بادشاہ تک سے خائف نہیں ہوتے تھے جو حق بات ہوتی بے دھڑک اس کا اعلان فرما دیتے۔

میرے عزیز دوست پیر حاجی محمد اسحاق جان (سامارو سندھ) جو خود بھی اس سلسلۂ طریقت — مجددیہ — کے ایک گل سرسبد ہیں اور اپنے اعزہ اور اہل خاندان سے ملنے کبھی کبھی افغانستان جایا کرتے ہیں۔ اپنا ایک مشاہدہ بیان کرتے ہیں۔

انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ وہ کابل میں تھے اور حضرت نور المشائخ کے مہمان تھے کہ عید کا دن آیا اہالیان شہر جوق در جوق اور موج در موج عیدگاہ کی طرف روانہ ہوئے ظاہر شاہ اور حضرت نور المشائخ کی نشست بالکل پہلو بہ پہلو تھی۔ نماز کے بعد وہاں کے قاضی القضاۃ نے ایک خطبہ دیا جس میں حالات حاضرہ پر روشنی ڈالی گئی تھی، پاکستان کا ذکر بھی آیا اور ظاہر ہے یہ ذکر خیر نہیں تھا۔ پاکستان کے خلاف زیادہ سے زیادہ زہریلے الفاظ میں جو کچھ کہہ سکتے تھے اس سے بھی زیادہ کہہ گزرے۔ حضرت نور المشائخ کا یہ عالم تھا کہ ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ طیش اور برہمی کے آثار چہرہ گرامی سے ہویدا

تھے لیکن خانۂ خدا کا احترام ہر حال میں واجب تھا خاموش رہے۔

نمازِ عید کے بعد، شاہ نے "سلام خانہ" میں دربار فرمایا، یہاں سفرائے دول، مشائخ شہر، علمائے مملکت، امرائے ذی وقار، حکام والا شان، وزیرانِ باتدبیر، مشیرانِ خوش تقدیر سب موجود تھے، اور باری باری سے شاہ کو عید کی مبارک باد اور دعائے درازیٔ عمر و ترقی اقبال دے رہے تھے۔

حاضرین میں وہ قاضی القضاۃ بھی تشریف فرما تھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے جنہوں نے پاکستان کو خوب ملاحیاں سنائی تھیں، جب شاہ سلام خانہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر جانے والوں کو رخصت کر رہے تھے تو شوق دست بوسی سے مجبور ہو کر قاضی القضاۃ صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے حضرت نور المشائخ کا دستِ مبارک ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا، حضرت نے دفعتاً ہاتھ کھینچ لیا اور ابھی وہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ بھی نہ کر پائے تھے کہ حضرت کا دست زبردست موصوف کے رخسار پر پڑا، حضرت نے ارشاد فرمایا، تو پاکستان کو جو ایک اسلامی ملک اور بہترین اسلامی مملکت ہے یوں برسرِ عام دشنام دیتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی؟۔

حضرت نور المشائخ جس طرح روحانی دنیا میں کوہ وقار تھے اسی طرح جسمانی پیمانے سے بھی کوہ پیکر تھے، انہیں صحیح معنی میں "بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" کہا جا سکتا تھا۔ ان کا طمانچہ کھا کر صاحبِ موصوف اتنی تیزی سے غائب ہوئے گویا اس مجمع میں موجود ہی نہیں تھے!

پاکستان کے معاملہ میں حضرت نور المشائخ اور افغانستان کی برسرِ اقتدار ٹولی میں سخت کشمکش پیدا ہو چکی تھی، رفتہ رفتہ تعلقات تلخ تر ہوتے گئے، اگر حضرت کچھ عرصہ تک مزید زندہ رہتے تو شاید حالات کچھ اور ہوتے۔ (اگست ۱۹۶۱ء)

قاضی ولی محمد

ایک صاحبِ دل اور صاحبِ نظر انسان

قاضی صاحب بھوپال میں متعدد بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے، مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال، اور موجودہ نواب صاحب بھوپال کے دور میں، متعدد خطابات سے بھی نوازے گئے، معتمد الملک دبیر الانشاء اور نہ جانے کیا کیا۔

اسلام اور مسلمانوں کے آثار و نقوش کے دلدادہ و شیدا تھے، سارے اسپین (اندلس) کا سفر کیا، ایک ایک شہر، ایک ایک قریہ، ایک ایک چپہ چھان ڈالا، یہ وہی اندلس تھا جس پر تقریباً آٹھ سو سال تک، جاہ و جلال، دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ عرب کے صحرا نشینوں نے حکومت کی تھی، جہاں، غرناطہ اور قرطبہ، اشبیلیہ اور مریہ اور دوسرے شہروں میں، عربوں کے آثار و نقوش اب تک دور ایام کے باوجود موجود ہیں، "قصر الزہراء" "مسجد قرطبہ" "قصر الحمراء" خواہ، خرابہ اور کھنڈر، دیر اور کلیسا کی صورت میں سہی، لیکن موجود ہیں، اور چشم مسلماں کے لیے موجب عبرت و موعظت ہیں۔

اسلام کی محبت، اور مسلمانوں کے باقیات الصالحات سے جنونانہ شیفتگی قاضی صاحب کے دل میں بدرجۂ اتم موجود تھی، وہ اندلس گئے، اور اس طرح گئے کہ مسلمانوں کے دور حکومت کے ہر نقش کا مطالعہ کیا، اس کی تصویر لی، اور واپس

نے اپنا سفرنامہ اندلس، اس شان سے چھاپا کہ اردو زبان میں اس حسن طباعت، اور
حسن بیان اور حسن ادب کی مثال مشکل سے ملے گی، ورجنوں تصویریں، ماضی اور حال
کی تمام اہم اور ضروری تفصیلات کے ساتھ،!

میں قاضی صاحب کے اس سفرنامہ کو شوق کی آنکھوں، اور عقیدت کی نگاہ سے
پڑھ چکا تھا، لیکن ملاقات کا نہ کوئی امکان تھا نہ احساس۔

ایک مرتبہ، بالکل عجیب طریقہ پر قاضی صاحب سے "نصف ملاقات" ہوئی
میری پہلی تصنیف "سیرۃ محمد علی" حال میں شائع ہوئی تھی، یہ کتاب میں نے طالب علمی
اور نوعمری کے زمانہ میں لکھی،

اس کتاب کی تعریف، اور تنقیص کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا،
جو لوگ محمد علی کے عقیدت مند اور ادا شناس تھے انھوں نے اس کتاب کے مولف
کی حوصلہ افزائی کی اور اسے سراہا، جو لوگ محمد علی سے اختلاف رکھتے تھے، اور ان کی
سیاست سے مختلف الرائے تھے، انھوں نے نوعمر، اور نو آموز مولف کو مہذب
اور غیر مہذب گالیاں دینے میں بھی تامل نہیں کیا، روزنامہ الجمیعۃ میں بلال احمد صاحب
زبیری نے، طویل مقالات، اور رسالہ پیشوا میں، عزیز حسن صاحب بقائی نے
متعدد شذرات و مقالات مخالفت میں تحریر فرمائے،

میرا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا،!

ایک روز عین اسی ہنگامہ کارزار کے عالم میں نامانوس سواد خط کے ساتھ
ایک مکتوب ملا، کھولا، پڑھا، اور غرق حیرت ہوگیا،

یہ دبیر الانشا قاضی ولی محمد صاحب کا طویل عنایت نامہ تھا، انھوں نے
"سیرت محمد علی" کی نہایت شاعرانہ انداز میں تعریف فرمائی تھی، اور آخر میں لکھا تھا میری
دانست میں تو یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل

کیا جائے، تاکہ ہر ہندوستانی، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، تحریک آزادی کے سب سے بڑے ہیرو محمد علی کا صحیح مرقع دیکھ سکے، اور اس سے سبق حاصل کر سکے۔ آپ نے یہ کتاب نہیں لکھی محمد علی کی تصویر کھینچ دی ہے"!!

کہہ نہیں سکتا، قاضی صاحب کے ان محبت بھرے الفاظ نے مجھے کتنا سرشار کیا، میں اکھاڑہ کا آدمی نہیں تھا، ابھی عملی دنیا میں قدم بھی نہیں رکھ پایا تھا، مخالف کے طوفان نے مجھے بہت پژمردہ کر دیا تھا، لیکن اس خط نے بڑے نازک موقع پر میری ہمت اور ڈھارس بندھائی، اور میں تازہ دم ہو گیا!

(اپریل ۱۹۳۴ء)

ظفر علی خاں

بڑے آدمیوں کو دیکھنے کا، ان سے ملنے کا، ان کی تقریریں سننے کا، ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے، مولانا ظفر علی خاں کا نام بچپن سے سن رہا تھا، گھر میں ان کی بڑائی کا چرچا ہوتا تھا، مدرسہ میں ان کی شخصیت پر گفتگو ہوتی تھی، لوگوں میں ان کے فکر و عمل پر بحث ہوتی تھی، میں ان سب سے بے تعلق تھا، نہ اتنی سمجھ تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کو پرکھ سکتا، نہ اتنا شعور تھا کہ ان کی شخصیت کو پہچان سکتا نہ اتنا عرفان تھا کہ وقت کی سیاست اور سیاست دانوں کی گتھیاں سلجھا سکتا، مولانا کا نام بار بار کان میں پڑتا رہتا رفتہ رفتہ یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ جس طرح مولانا محمد علی، شوکت علی اور حسرت موہانی وغیرہ بڑے آدمی ہیں، اس طرح مولانا ظفر علی خاں بھی کوئی بڑے آدمی ہوں گے علی برادران کا دور سے جلوہ دیکھنے کا کبھی کبھی اتفاق ہو جاتا تھا، لیکن مولانا ظفر علی خاں کے دیدار کا کوئی موقع میسر نہیں آیا، یہاں تک کہ مکتبی تعلیم ختم ہوئی، اور میں ندوۃ العلماء کے پہلے درجہ میں داخل کر دیا گیا، اس ابتدائی درجہ میں داخلے کو چند ماہ ہوئے ہوں گے کہ ایک دن غلغلہ مچا، مولانا ظفر علی خاں تشریف لا رہے ہیں، اب تک مولانا کا صرف نام سننے کا اتفاق ہوا تھا چلو آج ان کی زیارت بھی ہو جائے گی، دل میں خوشی کی ایک لہری پیدا ہوئی، اور قبل اس کے کہ مولانا تشریف لائیں، میرے ذہن کا

مصور مولانا کی تصویر تیار کر چکا تھا، جب اتنے بڑے آدمی ہیں تو واقعی بہت بڑے آدمی ہوں گے، موٹے تازے، چوڑے چکلے، ممکن ہے داڑھی ہو، ممکن ہے نہ ہو، داڑھی ہوئی تو مولانا محمد علی سے ضرور مشابہ ہوں گے، نہ ہوئی تو ——؟

اتنے میں میں نے دیکھا، مولانا سید سلیمان ندوی کے ہمراہ ایک صاحب تشریف لا رہے ہیں، داڑھی تھی لیکن انفرادیت کی شان، نہ عبا، نہ عمامہ، نہ جبہ، نہ دستار، نہ پگڑی، مولانا یت کی کوئی علامت ہی موجود نہیں، چوڑی موری کا پاجامہ، ترکی کوٹ، سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، سید صاحب سے باتیں کرتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں ہر ہر کمرے میں جاتے ہیں طلبا کا طرز ماند و بود دیکھتے ہیں، خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں، جس کمرے سے نکلتے ہیں اس کے مکین، ایک قافلہ کی صورت میں مولانا کے ساتھ چلنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ بورڈنگ کے معائنہ سے فارغ ہو کر مولانا طلباء کی لائبریری میں پہنچے، جہاں قلمی رسالے تھے جو طلباء اپنے ہاتھ سے لکھ کر لائبریری کی میز پر رکھ دیتے تھے، مولانا نے ان رسائل کا مطالعہ کیا اور خوشنودی مزاج کا اظہار کیا، فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر لائبریری کو عطیہ دیا، اور وعدہ کیا کہ لاہور پہنچ کر زمیندار مفت جاری کر دیں گے، پھر ندوہ کے شاندار ہال میں ایک اجتماع ہوا، اور مولانا ظفر علی خاں نے ایک معرکہ آرا تقریر کی، تقریر میری سمجھ میں تو نہیں آئی، اس لیے کہ استعداد سے باہر تھی، لیکن حاضرین کے جوش و خروش کا منظر قابل دید تھا، ——؛ یہ تھا مولانا ظفر علی خاں کو پورے طور پہ نہ سمجھ سکنے کے باوجود، ان کی

غلط اور بڑائی کا پہلا نقش۔

کچھ عرصے بعد، نجدیوں اور وہابیوں کے خلاف سلطان ابن سعود کے بعض اقدامات سے سارا ہندوستان متزلزل ہو گیا، لکھنؤ اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا، یہاں کسی میں ہمت نہیں تھی کہ سلطان ابن سعود کی تائید میں یا تحسین میں ایک لفظ بھی کہہ سکے، فرنگی محل کے علماء عوام پر اثر و رسوخ رکھتے تھے، اور سارا فرنگی محل ابن سعود کا سخت مخالف تھا، یہ واقعات اس زمانے کے ہیں جب میری حیثیت ایک طفل کم سواد سے زیادہ نہ تھی، میں نہیں کہہ سکتا مولانا ظفر علی خاں کس سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے، لیکن اتنا یاد ہے، جاڑوں کا موسم تھا، امین آباد کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں کچھ چہل پہل سی نظر آئی، ہم چند دوست آگے بڑھے کہ دیکھیں معاملہ کیا ہے؟ معلوم ہوا ایک عام جلسہ ہے، اور مولانا ظفر علی خاں تقریر فرمائیں گے، ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جلسہ کے صدر علامہ سلیمان ندوی، رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ سید صاحب نے ایک نہایت سلجھی ہوئی تقریر کی، حاضرین خاموشی سے سنتے رہے، اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں کی باری آئی، انھوں نے ایک پرزور اور پرجوش تقریر کی، حاضرین کے بحر مزاج میں بھی تلاطم پیدا ہوا، مولانا نے یہ رنگ دیکھا تو ان کی عزیمت اور استقامت کچھ اور بڑھ گئی، انھوں نے بلند آہنگی کے ساتھ سلطان کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا، اور حاضرین کی طرف سے بار بار نعرے بلند ہونے لگے، حاضرین کے نعروں اور مولانا کی تقریر میں تصادم جاری تھا، اور ہر لمحہ یہ اندیشہ بڑھتا جاتا تھا کہ اب ..... کرسیاں اچھلیں گی، اور "رفع یدین" شروع ہوگا، سید صاحب دم بخود تھے،

کے لیڈر تھے، مولانا کو ہموار کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے، وہ ظفر علی خاں میں لچک پیدا کر سکے، وہ ظفر علی خاں کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے کہ جو کچھ وہ سچ سمجھ رہے ہیں، اسے نہ کہیں، جلسہ میں ہنگامہ جاری تھا، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے مرید و حلقہ بگوش ایک سیل تند و سبک سیر کی طرح آگے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے، اور اس سارے اجتماع میں کوئی ایسا نہ تھا جو مولانا کا پشت پناہ ہوتا، جو مولانا کے ساتھ مرنے اور جان دینے پر تیار ہوتا، مولانا کو اپنی تنہائی کا اپنے اکیلے ہونے کا احساس تھا، پھر بھی نہ چہرے پہ ہراس تھا نہ ماتھے پر شکن، نہ پائے ثبات میں لغزش! ہنگامہ آرائی کے اس طوفان میں مولانا کی تقریر جاری رہی اور ختم ہو گئی اس واقع کو ایک چوتھائی صدی گزر چکی ہے، لیکن آج تک یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جیسے کل کا واقع ہو، جس کا نقش مٹائے نہیں مٹتا

غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے، نئی دلی میں مسٹر غیاث الدین کی کوٹھی پر سر سکندر حیات خاں مقیم تھے، ان کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی دی گئی، اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، مولانا شوکت علی بھی دلی میں تھے وہ بھی اس پارٹی میں تشریف لے گئے! راقم الحروف بھی ضمیمہ کی طرح مولانا کے ساتھ تھا، اس اجتماع میں سر ضیاالدین بھی تشریف رکھتے تھے، باتوں باتوں میں تذکرہ علی گڑھ کا چھڑا، ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہم درس یا ہم دور اصحاب کی جو فہرست سنائی، اس میں عبدالحق، شوکت علی اور ظفر علی خاں کے نام بھی تھے شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا شوکت علی، اور مولانا ظفر علی خان میں تلخ ترین اختلاف فکر و نظر کے باوجود برادرانہ تعلقات قائم تھے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کر کے مضمون ختم کر دوں گا۔

مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں کے مابین اختلافات قائم ہیں، زمیندار

اور "خلافت" میں خوب زور شور سے جنگ جاری ہے، مولانا شوکت علی کے تخطی مضامین خلافت میں اور مولانا ظفر علی خاں کی کیفیت آفرین نظمیں زمیندار میں شائع ہو رہی ہیں کہ دلی میں مسئلہ فلسطین سے متعلق صورت حالات پر غور کرنے کے لیے مسلم لیڈروں کا ایک اجتماع ہوتا ہے،

دریا گنج کے ایک دو منزلہ مکان میں اس اجتماع کے سربرآوردہ اصحاب ٹھہرائے جاتے ہیں، آمنے سامنے دو کمرے ہیں ایک کمرہ میں مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود، اور راقم الحروف مقیم ہیں، دوسرے کمرے میں ظفر علی خاں اپنی پارٹی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔

صبح کا وقت ہے مولانا ظفر علی خاں نیلی قمیص پہنے ہوئے نئی دلی تک واکنگ کر کے پسینے میں شرابور ابھی ابھی واپس آئے ہیں، پارٹی کے لوگ ان کے انتظار میں بیٹھے ہیں، کہ آپ غسل سے فارغ ہوں، ناشتہ کریں، ضروری ہدایات دیں۔ اجلاس ناشتہ کے فوراً بعد شروع ہو جاتا تھا، ڈاکٹر سید محمود اور شوکت علی آپس میں باتیں کر رہے ہیں کہ شوکت علی کی نظر ظفر علی خاں پر پڑتی ہے، وہ آواز دیتے ہیں "ظفر علی خاں" یہ جواب دیتے ہیں "جی" وہ کہتے ہیں "یہاں آؤ" یہ فوراً اندر داخل ہو جاتے ہیں، یہ دونوں میں خوب گھل مل کر باتیں ہوتی ہیں، اسی بے تکلفی کے ساتھ جو صرف ایک علیگ دوسرے علیگ کے ساتھ کرتا ہے وہ "تم" سے خطاب کرتے ہیں، یہ "آپ" سے جواب دیتے ہیں۔

صاف معلوم ہوتا ہے بے تکلفی کے ساتھ عمر کا فرق چھوٹے کو بڑے کی جناب میں گستاخ نہیں ہونے دیتا، وہاں مجلس مضامین شروع ہو جاتی ہے اور یہاں گپوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کبھی علی گڑھ کی یاد، کبھی ماضی کا تذکرہ

کچھ آئندہ کا پروگرام، حیرت ہوتی تھی، سیاست کی بازی گاہ کے یہ دونوں حریف آپس میں اتنے گہرے، اتنے اچھے، اتنے مخلص دوست بھی ہو سکتے ہیں، لیکن تھے — کاش یہ رنگ آج بھی کہیں نظر آ سکتا۔

پیدا کہاں ہیں۔ ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ظفر علی خاں

ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت

اردو زبان کے لاکھوں شاعروں اور انشاد پردازوں میں بہت سی صدا بہار شخصیتیں ملیں گی، جن کے قلم کی گل کاریاں ادب کے باغ و چمن کی زینت ہیں، جن کی زبان سے پھول جھڑتے ہیں جن کے قلم سے موتی ٹپکتے ہیں، جن کے افکار کی بلندی خلک الافلاک تک پہنچتی ہے، جن کے انداز و اسلوب میں رعنائی ہے، بانکپن ہے زندگی ہے، لیکن تجزیہ کیجیے تو ان میں سے اکثر ایسے ملیں گے، جو یک فنی ہیں، کسی ایک خاص چیز میں اختصاص رکھتے ہیں، جامعیت اور ہمہ گیری بہت کم لوگوں میں ملے گی،

ابوالکلام سے خطابت چھین لو تو وہ کہیں نظر نہ آئیں گے، شبلی کے قبضہ سے تاریخ کی اقلیم نکل جائے تو وہ شاہ بے تاج رہ جائیں گے، سید سلیمان تحقیق اور تدقیق کے رستم داستاں ہیں، مہدی حسن ادب لطیف کے روح رواں ہیں، عبدالماجد کی کج کلاہی، طنز ادب، اور تاریخ کی رہین منت ہے،

عبدالحق سے "مقدمہ سازی" کا جوہر لے لیا جائے تو کچھ نہ رہیں گے رشید احمد طنز و مزاح کے ہیرو ہیں، سید محفوظ علی شگفتہ نگاری اور بلاغت کے استاد ہیں محمد حسین آزاد الفاظ گوناگوں کے حاکم ہیں، شاعروں میں حالی، قوم کا مرثیہ خوانی کے لیے، ــــ اکبر حال کے واقعات سے بات میں بات پیدا کرتے ہیں، اقبال مستقبل کا شاعر ہے، جوش کے ہاں طاقت لسانی اور ہجوم الفاظ کے

سوا کچھ نہیں جگر تغزل کے بادشاہ ہیں، حسرت موہانی شاعری کے امام ہیں، لیکن نثر کے میدان میں جب چلتے ہیں، تو قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، غرض جتنے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھیے، وہ کسی ایک ہی فن میں یکتا اور ہمتا نظر آئیں گے۔ دوسرے فن کی طرف یا تو رخ نہیں کریں گے، اور اگر متوجہ ہوئے بھی تو صاف معلوم ہو جائے گا، یہ وہ منزل ہے، جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا۔!

لیکن چند مستثنیٰ اور منفرد ہستیوں میں سر فہرست جس شخص کا نام لیا جا سکتا ہے، وہ ظفر علی خاں ہیں،

آج ترجمہ کا فن بہت ترقی کر گیا ہے، عنایت اللہ اور عابد حسین نے اس فن کو چار چاند لگا دیے ہیں، لیکن جس نے "معرکہ مذہب و سائنس" دیکھا ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ڈریپر کی اوریجنل کتاب سے معنویت، افادیت سلاست اور روانی میں ظفر علی خاں کا یہ ترجمہ بڑھ گیا ہے ڈریپر زندہ ہوتا تو ظفر علی خاں کے ہاتھ چوم لیتا اور کوشش کرتا کہ اس ترجمہ کا ترجمہ کرے، ظفر علی خاں نے صحافت کے میدان میں جب قدم رکھا تو وہ منفرد نہ تھے، لیکن قدم رکھنے کے بعد وہ منفرد بن گئے جب انھوں نے "زمیندار" ادارت پر قبضہ کیا تو بہت سے حریف اور رقیب موجود تھے، دیرینہ سال اور آزمودہ کار، لیکن اس نوخیز اور نوجوان کے سامنے وہ نہ ٹھیر سکے، اخبارات کا طغرائے امتیاز یہ تھا کہ ہزار پانچ سو کاپیاں چھپ جائیں، لیکن ظفر علی خاں کا اخبار اس زمانے میں بیس بائیس ہزار تک پہنچ گیا، یہ ہندوستان کی اردو تاریخ صحافت کا عجوبہ تھا، اور اس کا صدور صرف ظفر علی خاں ہی سے ممکن تھا، آج بہت سے نامور رسالے نکل رہے ہیں، عروس جمیل در لباس حریر کی صورت ہیں، لیکن آج سے ۵۴، ۵۰ سال پہلے حیدر آباد دکن سے ظفر علی خاں نے جو ماہنامہ نکالا تھا، وہ اپنے موضوع، ہمہ گیری سلیقہ اور شائستگی

کے اعتبار سے آپ اپنا جواب تھا، اب تک اس کا کوئی جواب پیدا نہ ہو سکا لوگوں نے شاعری کو ایک دیوی بنا کر پوجا، لیکن ظفر علی خاں کے گھر میں شاعری کنیز بن کر داخل ہوئی، قافیے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں الفاظ اس کی نوک قلم تک پہنچنے کے لیے بیتابانہ اور والہانہ دوڑ لگاتے ہیں، سجے ہوئے قافیے، ترشے ہوئے الفاظ۔!

خطابت ظفر علی خاں کا جوہر ہے، ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں اس آتش مقال اور شعلہ نوا خطیب نے، مر مٹنے، جان دے دینے ملت پر فدا ہونے، اور مذہب پر قربان ہو جانے کا ولولہ پیدا کر دیا، وہ پبلک پلیٹ فارم پر ہمیشہ ایک طوفان بن کر نمودار ہوا، اور اس طوفان نے قصر استعمار کی بنیادیں ہلا دیں، اس نے سامراج کے ایوان میں تہلکہ ڈال دیا، یہ خود تنہا تھا اور نہتوں ہی کو لے کر اس نے اقدام و یلغار کا پروگرام بنایا، اور دنیا یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی، کہ بارہا ان نہتوں نے وقت کی سب سے بڑی، مسلح اور مستحکم، ظالم اور سفاک، خون آشام اور بربر صفت حکومت کو سراسیمہ اور بدحواس کر دیا، اس نے جیل کا رخ کیا، تو خلقت ادھر ٹوٹ پڑی، اور وہاں قیدیوں کے رکھنے کی جگہ نہ رہی، وہ میدان میں پہنچا تو عوام جوق در جوق، فوج در فوج اور موج در موج ادھر بڑھے، اور وہاں سے واپس ہوئے تو فداکاروں، جاں نثاروں اور سرفروشوں کا سیل رواں بن کر، جس سے ٹکراتے ہوئے برطانوی استعمار بھی کانپتا تھا، اور لرزتا تھا۔

زندگی کے ۸۰ سال ظفر علی خاں نے اس طرح گزارے، کہ وہ برق جہندہ کی طرح کبھی مشرق میں چمکا، کبھی مغرب میں، کبھی جنوب میں گرجا، کبھی شمال میں

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی

جو دل میں وہ زباں پر، اللہ جانتا ہے!

نواب عبداللہ خاں نظام حیدر آباد، مہاراجہ پٹیالہ، اور مہاراجہ گوالیار سے لے کر، ایڈورڈ ہفتم، جارج پنجم اور ولی عہد جرمنی تک کے مصاحب اور ندیم رہے انگریزی کے بہترین رائٹر، اور اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز، عہد شباب کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ گورنر بمبئی اور نظام دکن کی ناک کے بال بنے ہوئے تھے، دشمن ان سے کانپتے، اور دوست ان پر جان دیتے، لاکھوں روپیہ کمایا کھایا، اور کھلایا، جس کے دشمن بن جائیں، اسے جہنم کے دروازہ تک پہنچا کر دم لیں، جس کے دوست بن جائیں اس کے لیے نئی نئی جنتیں تعمیر کرادیں، دوستوں کو خوب خوب فائدے پہنچائے اور دشمنوں کو زک دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، بڑے نڈر اور بے باک اظہار رائے میں بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے کبھی نہیں جھکے،!

جو دل میں وہ زبان پر اللہ جانتا ہے!

اس کا قلم نیزے اور بھالے کا کام کرتا تھا، پگڑی اچھالنے پر آئیں تو نہ گاندھی جی کو چھوڑیں، نہ علی برادران کو، نہ مہاراجہ محمود آباد کو، نہ گورنمنٹ کے کسی بڑے سے بڑے آفیشیل کو، اور پگڑی اس شان اور صفت سے اچھالتے تھے کہ

برسا، لیکن اب وہ تھک گیا ہے، اور گذشتہ چند سال سے ضعف و نقاہت علالت اور بیچارگی کا پیکر بنا ہوا کرم آباد کے ایک گوشے میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہے، لیکن وہ اب بھی مذہب کے عشق سے سرشار اور قوم کی محبت سے مخمور ہے، یہی اس کا وظیفہ ہے، یہی اس کی دعا۔

وظیفے سب چھوٹے ایک نام تیرا
دعائے شام ہے، ورد سحر ہے۔

اور چاہوں کہ سنبھالوں تو سنبھالے نہ بنے!

آخر میں روزنامہ ہمدم خرید لیا تھا وہ تیر و نشتر بن کر نکلتا تھا اور بڑوں بڑوں کے چھلنی کر کے رکھ دیتا تھا، ان کے نام سر تیج بہادر سپرو، سر علی امام، اور دت کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں کے خطوط دیکھئے تو یہ معلوم ہوگا جیسے کسی بڑے بہت بڑے آدمی کو کوئی چھوٹا بہت چھوٹا آدمی مخاطب کر رہا ہو۔

کسی پارٹی سے کبھی وابستہ نہیں رہے، کسی جماعت سے کبھی غیر مشروط تعاون نہ کیا، کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا لوہا نہ مانا، سب کو ہیچ سمجھتے رہے، سب پر اعتراض و اختلاف کے تیر برساتے رہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

ایک زمانے میں چودھری خلیق الزماں سے ٹھن گئی، ان کے پاس اخبار تھا، اُن کے پاس زبان تھی، یہ اپنے "فانوس خیال" میں ان کے خلاف دل کے جلے پھپھولے پھوڑا کرتے تھے، وہ اپنے وسیع حلقہ احباب میں ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے، دونوں کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں کی رپورٹ پابندی کے ساتھ ملا کرتی تھی، ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یہ واکنگ کرتے ہوئے سکندر باغ کی طرف جا رہے تھے، اور وہ بھی اپنی موٹر پر اسی راستے سے گزر رہے تھے، صبح کا سہانا وقت، ویران سڑک ہو کا عالم، آدم نہ آدم زاد، صرف چڑیاں تھیں جو درختوں کی ڈالیوں اور ٹہنیوں پر اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ثنا میں مصروف تھیں، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، صبا رفتار موٹر رک گئی، برق رفتار قدم جم گئے، وہ موٹر سے اترے، انہوں نے آستینیں چڑھا لیں یہ روز فانوس خیال میں اپنے ہجویہ اشعار نثر کی صورت میں شایع کیا کرتے تھے، خلیق صاحب نے جواب آں شعر زبان کے بجائے ہاتھ سے دیا، پھر دونوں اپنے اپنے راستے چلے گئے، ہمدم کے صفحات میں اور حلقہ

احباب میں زبان وقلم کی جنگ اور زور پکڑ گئی، لیکن جب مہاجارت ہمیشہ نہ جاری رہی تو یہ جنگ دوام کیسے اختیار کرتی، اور آخر کار ختم ہوگئی۔

ہمدم کی کتابت، بصارت سوز، طباعت روح فرسا، کاغذ نہایت مہمل لیکن عبداللہ خاں کے قلم کی کشش ایسی تھی کہ ہزاروں کی تعداد میں چھپتا تھا لوگ گالیاں دے دے کر خریدتے تھے۔ اللہ کا دیا پہلے سے بہت کچھ تھا، ہمدم خریدنے اور اس کے جاری کرنے کا مقصد کسب زر نہ تھا، اپنے افکار وخیالات کی تبلیغ و تشہیر تھی اور یہ مقصد بڑی خوبی سے حاصل ہوتا رہا۔

خود بینی کا مادہ اور انانیت کا جذبہ بہت تھا، وقفتہ کے بڑے آدمیوں میں سے جہاں کسی نے سر اٹھایا اور انھوں نے کھٹاک سے اس کے ان نیاز مندانہ خطوط کی اشاعت شروع کر دی جو غریب نے اپنے دور ہیچ میرزی اور ان کے دور اقبال میں لکھے تھے آخر اس بیچارے کو چپ سادھنی پڑتی تھی، اور یہ

منم گرز و میدان و افراسیاب!

کا نعرہ لگاتے رہے، یہاں تک کہ حریف میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا اور یہ کوس لمن الملک بجانے لگتے۔

زندگی کے ہر دور میں خدا سے اپنا رشتہ نہایت مضبوطی سے قائم رکھا، نماز کبھی ناغہ نہ ہونے دی اور وظائف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا صوفیوں کی ارادتمندی جزو زندگی رہی، بوڑھے پہلے ہی سے تھے، زمانے نے اور بوڑھا کر دیا، از کار رفتہ ہو گئے، صاحبزادے دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور وطن سے دور "ہمدم" بیچ ڈالا، خود گوشہ نشین ہو گئے، پارٹیوں اور سوسائٹیوں میں شرکت سے پہلے ہی سے احتراز کرتے تھے، اب گھر پر ملنے سے بھی کترانے لگے، ہندوستان کے حالات نے فسادات کے باعث نازک صورت اختیار کی تو حیدرآباد کو

اور چاہوں کہ سنبھالوں تو سنبھالے نہ بنے!

آخر میں روزنامہ ہمدم خرید لیا تھا وہ تیر و نشتر بن کر نکلتا تھا اور بڑوں بڑوں کے چھلنی کر کے رکھ دیتا تھا، ان کے نام سر تیج بہادر سپرو، سر علی امام، اور دوست کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں کے خطوط دیکھئے تو یہ معلوم ہوگا جیسے کسی بڑے بہت بڑے آدمی کو کوئی چھوٹا بہت چھوٹا آدمی خطاب کر رہا ہو۔

کسی پارٹی سے کبھی وابستہ نہیں رہے، کسی جماعت سے کبھی غیر مشروط تعاون نہ کیا، کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا دبدبہ نہ مانا، سب کو ہیچ سمجھتے رہے، سب پر اعتراض و اختلاف کے تیر برساتے رہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

ایک زمانے میں چوہدری خلیق الزماں سے ٹھن گئی، ان کے پاس اخبار تھا، اُن کے پاس زبان تھی، یہ اپنے "فانوس خیال" میں ان کے خلاف دل کے جلے پھپھولے پھوڑا کرتے تھے، وہ اپنے وسیع حلقہ احباب میں ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے، دونوں کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں کی رپورٹ پابندی کے ساتھ ملا کرتی تھی، ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یہ واکنگ کرتے ہوئے سکندر باغ کی طرف جا رہے تھے، اور وہ بھی اپنی موٹر پر اسی راستے سے گزر رہے تھے، صبح کا سنسان وقت، ویران سڑک ہو کا عالم، آدم نہ آدم زاد، صرف چڑیاں تھیں جو درختوں کی ڈالیوں اور ٹہنیوں پر اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ثنا میں مصروف تھیں، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، صبا رفتار موٹر رک گئی، برق رفتار قدم جم گئے، وہ موٹر سے اترے، انہوں نے آستینیں چڑھا لیں یہ روز فانوس خیال میں اپنے مجوبہ اشعار نثر کی صورت میں شایع کیا کرتے تھے، خلیق صاحب نے جواب آں شعر زبان کے بجائے ہاتھ سے دیا، پھر دونوں اپنے اپنے راستے چلے گئے، ہمدم کے صفحات میں اور حلقہ

احباب میں زبان و قلم کی جنگ اور زور پکڑ گئی، لیکن جب مہابھارت ہمیشہ نہ جاری رہی تو یہ جنگ دوام کیسے اختیار کرتی، اور آخر کار ختم ہو گئی۔

ہمدم کی کتابت، بصارت سوز، طباعت روح فرسا، کاغذ نہایت مہمل لیکن عبداللہ خاں کے قلم کی کشش ایسی تھی کہ ہزاروں کی تعداد میں چھپتا تھا لوگ گالیاں دے دے کر خریدتے تھے۔ اللہ کا دیا پہلے سے بہت کچھ تھا، ہمدم خریدنے اور اس کے جاری کرنے کا مقصد کسب زر نہ تھا، اپنے افکار و خیالات کی تبلیغ و تشہیر تھی اور یہ مقصد بڑی خوبی سے حاصل ہوتا رہا۔

خود بینی کا مادہ اور انانیت کا جذبہ بہت تھا، وقت کے بڑے آدمیوں میں سے جہاں کسی نے سر اٹھایا اور انھوں نے کھٹاک سے اس کے ان نیاز مندانہ خطوط کی اشاعت شروع کر دی جو غریب نے اپنے دورِ ہیچ میرزی اور ان کے دور اقبال میں لکھے تھے آخر اس بیچارے کو چپ سادھنی پڑتی تھی، اور یہ

منم گرزد میدان و افراسیاب!

کا نعرہ لگاتے رہے، یہاں تک کہ حریف میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا اور یہ کوس لمن الملک بجانے لگتے۔

زندگی کے ہر دور میں خدا سے اپنا رشتہ نہایت مضبوطی سے قائم رکھا، نماز کبھی ناغہ نہ ہونے دی اور وظائف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا صوفیوں کی ارادتمندی جزو زندگی رہی، بوڑھے پہلے ہی سے تھے، زمانے نے اور بوڑھا کر دیا، از کار رفتہ ہو گئے، صاحبزادے دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور وطن سے دور "ہمدم" بیچ ڈالا، خود گوشہ نشین ہو گئے، پارٹیوں اور سوسائٹیوں میں شرکت سے پہلے ہی سے احتراز کرتے تھے، اب گھر پر ملنے سے بھی کترانے لگے، ہندوستان کے حالات نے فسادات کے باعث نازک صورت اختیار کی تو حیدرآباد کو

امن سمجھ کر سب کچھ بیچ باچ کر وہاں پہنچ گئے، وہاں کے حالات نے بھی نازک صورت اختیار کی اور بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا نے حیدر آباد کی انفرادیت ختم کر دی، فالج زدہ حالت میں پھر لکھنؤ پہنچے۔

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر!

آخر زندگی کی سانسیں پوری ہو گئیں، خدا انجام بخیر کرے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، ربوبیت کاملہ سے امید ہے کہ ان کی خدا پرستی اور مذہبیت رائگاں نہ جائے گی۔

اس کتاب کی ترتیب کے وقت ملا واحدی صاحب مدیر نظام المشائخ کا ایک مضمون نواب صاحب پر گذرا، جو اپنی معنویت و افادیت کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے کہ اس مضمون کا تتمہ بنا دیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

"نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی اب بہت کم لوگوں کو یاد ہوں گے۔ وہ ایک اخبار نویس تھے اور اخبار نویس بھی غیر معمولی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کوئی پوشیدہ قابلیت ایسی دی تھی کہ اپنے زمانے کے ممتاز شخص کہے جا سکتے ہیں، اپنی اخبار نویسی کا بھرم انھوں نے بڑی شان سے قائم کیا تھا۔

۱۹۱۰ء میں جرمنی کا ولی عہد ہندوستان کی سیاحت کرنے آیا تھا۔ ولی عہد جہاں جاتا تھا اردو اخبار نویسوں کے نمایندے کی حیثیت سے نواب کسمنڈوی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ نواب صاحب اخبار نویس برائے نام سہی، لیکن اس میں شک نہیں کہ ولی عہد جرمنی کے ساتھ رکھنے کے لیے ان سے بہتر اخبار نویس کا انتخاب انگریزی حکومت نہیں کر سکتی تھی۔

ولی عہد دلی پہنچا تو نواب صاحب حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رح کی درگاہ

میں حاضر ہوئے اور خواجہ حسن نظامی صاحبؒ سے ملے، پھر خواجہ صاحب اور نواب صاحب میرے پاس دلّی تشریف لائے، خواجہ صاحب نے میرا اور نواب صاحب کا تعارف کرایا۔

۱۹۱۰ء میں ولی عہد جرمنی نے ہندوستان کا دورہ لگایا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کے ساتھ بھی نواب صاحب تھے کیے گئے۔

نواب صاحب کا خیمہ جارج پنجم کے خیمے کے بالکل نزدیک تھا۔ بے حد آراستہ و پیراستہ مگر نواب صاحب نے خیمے کی آرائش اور آسائش چھوڑ کر میرے گھر قیام فرمایا تھا۔

میرے ہاں دربار کی وجہ سے کافی مہمان تھے، بلیں پچیس آدمیوں کا قافلہ تو فقط لاہور کے زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی مرحوم کا تھا۔ سب زمین پر بستر بچھاتے تھے۔ نواب کمنڈوی کو بھی زمین پر سونا پڑتا تھا مگر وہ زمین پر سونے سے خوش تھے۔

ہر شاہی تقریب میں نواب کمنڈوی کی شرکت لازمی تھی، تقریبات عموماً رات کے گیارہ بجے تک رہتی تھیں، نواب صاحب ایک ایک بجے واپس پہنچتے تھے، لیکن پہنچتے ضرور تھے اور ایک بجے لیٹتیں یا دو بجے، اٹھ جاتے تھے ہمیشہ اندھیرے سے۔ میں جاگتا تو نواب صاحب کو نماز پڑھتے یا قرآن مجید پڑھتے یا مثنوی مولانا رومؒ پڑھتے پاتا۔ قرآن اور مثنوی اتنے موثر لحن سے پڑھتے تھے کہ سن کر دل چوٹ کھاتا تھا۔ عبادت ختم کر کے نواب صاحب داڑھی مونڈتے، کپڑے بدلتے اور ہلکا سا ناشتہ کرتے اور دربار کے ایک بجے تک کے واسطے رخصت ہو جاتے۔

کپڑے نواب صاحب کے سوٹ کیس میں زیادہ نہیں تھے۔ دو گرم شیروانیاں، چھ سات ٹھنڈی شیروانیاں، چھ سات لٹھے کے آڑے پاجامے جوتوں کا شاید ایک ہی جوڑا تھا۔ جامہ زیب جوان رعنا تھے۔ گٹھا جسم اور موزوں قد، لباس ان پر کھلتا تھا۔

بابو بشمبر ناتھ

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو!

یو پی کا ایک ضلع ہے، سیتاپور، اسی کا ایک قصبہ ہے خیرآباد، راقم الحروف کا دادھیال سیتاپور اور ننھیال خیرآباد ہے، زندگی کا ابتدائی حصہ، سیتاپور میں گزرا پھر والد کے انتقال کے بعد خیرآباد مسکن بن گیا،

بابو بشمبر ناتھ، سیتاپور کے رہنے والے تھے، قوم کے کھتری، مذہب کے ہندو دل کے انسان، یہ والد کے گہرے دوستوں میں تھے، ٹاسن گنج میں ان کی بہت بڑی دوکان تھی، جہاں ہر قسم کے ولایتی کپڑے ——— سوتی اور اونی ——— بکا کرتے تھے۔

بابو بشمبر ناتھ، دھوتی باندھتے تھے، کرتا پہنتے تھے، سر پر دوپلی ٹوپی استعمال کرتے تھے، بڑی بڑی مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، گورا اور سونے کی طرح چمکتا ہوا رنگ بڑے ہنس مکھ اور شگفتہ طبع آدمی تھے، والد کے انتقال کے بعد، گارجین شپ کا جھگڑا شروع ہوا، سوال پیدا ہوا جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کا۔ متوفی کے بنا با آہم دونوں بھائی بالکل کم سن تھے، والدہ، والدہ کی حیثیت سے مدعی تھیں، اور چچا، چچا کی حیثیت سے دونوں طرف سے وکیلوں، اور بیرسٹروں کی خدمات معقول معاوضہ پر حاصل کی گئیں۔ عدالت سے گارجین شپ کا فیصلہ ہونے تک، تمام کام معطل تھے۔ آمدنی

بھی، وصولی بھی، لیکن ضروریات کیونکر معطل کیے جاتے؟ اب پریشانیوں کا دور شروع ہوا، اور اسی موقع پر کھرے دوستوں کی شناخت ہوئی، بہتوں سے ہمدردوں نے منہ موڑ لیا، بہت سے دوستوں نے راستہ بدل دیا، بہت سے عزیزوں نے خود بخود اپنی معذوریوں، مجبوریوں اور گراں باریوں کے افسانے سنانے شروع کر دیے، لیکن والد کے جو چند دوست آخر وقت تک اپنی دوستی اور رفاقت میں ثابت قدم رہے، ان میں میرے نزدیک سب سے پہلا درجہ بابو بشمبر ناتھ کا تھا، اس لیے کہ والد کے مسلمان دوستوں کے تعلقات و روابط خاندان کے دوسرے بزرگوں اور عزیزوں سے بھی تھے، انکی رفاقت میں، ان تعلقات کے عناصر شامل تھے، لیکن بابو بشمبر ناتھ، میرے نانا اور دوسرے عزیزوں سے قطعاً غیر متعلق تھے، انھیں صرف والد مرحوم کا خیال تھا،!

گارجین شپ کے مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک اور اس کے بعد بھی، ایک عرصہ دراز تک بابو بشمبر ناتھ کی دوکان ہماری دوکان تھی، جتنے اور جس قسم کے اور جس قیمت کے کپڑے کی ضرورت ہو صرف ایک رقعہ کافی تھا، دام ہمیشہ دیر میں ملتے تھے، اور کبھی کبھی بعض حالات کے ماتحت خطرہ میں بھی پڑ جاتے تھے، لیکن ابا جی نے جو اصول بنا لیا تھا، اور جو وضع قائم کر لی تھی اس میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، جب مال طلب کیا گیا، بے تامل بھیج دیا، یہ ضرور ہے جب رقم زیادہ ہو جاتی تھی تو وہ پختہ کاغذ لکھا لیتے تھے، اور جب وہ زائد المیعاد ہونے لگتا تھا، تو اس کی تجدید کرا لیتے تھے، لیکن نہ انھوں نے کبھی مقدمہ کیا، نہ مقدمہ کی دھمکی دی، نہ یاد دہانی کی حد سے آگے بڑھ کر، شدید تقاضہ کی سرحدیں داخل ہوئے، حالانکہ ان کی رقم سیکڑوں کی حد سے تجاوز کر کے، ایک ہزاری منصب کے قریب قریب پہنچ چکی ہوتی تھی۔

مجھے بابو بشمبر ناتھ کا ایک اور واقعہ بھی نہیں بھولتا،!

بابو بشمبر ناتھ

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو!

یوپی کا ایک ضلع ہے، سیتاپور، اسی کا ایک قصبہ ہے خیرآباد، راقم الحروف کا دادھیال سیتاپور اور ننہیال خیرآباد ہے، زندگی کا ابتدائی حصہ، سیتاپور میں گزرا پھر والد کے انتقال کے بعد خیرآباد مسکن بن گیا،

بابو بشمبر ناتھ، سیتاپور کے رہنے والے تھے، قوم کے کھتری، مذہب کے ہندو ملی کے انسان!! یہ والد کے گہرے دوستوں میں تھے، ۲ سن گنج میں ان کی بہت بڑی دوکان تھی، جہاں ہر قسم کے ولایتی کپڑے —— سوتی اور اونی —— بکا کرتے تھے۔

بابو بشمبر ناتھ، دھوتی باندھتے تھے، کرتا پہنتے تھے، سر پر دوپلی ٹوپی استعمال کرتے تھے، بڑی بڑی مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، گورا اور سونے کی طرح چمکتا ہوا رنگ بڑے ہنس مکھ اور شگفتہ طبع آدمی تھے، والد کے انتقال کے بعد، گارجین شپ کا جھگڑا شروع ہوا، سوال پیدا ہوا جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کا۔ تعلق کسے بنایا جائے ہم دونوں بھائی بالکل کم سن تھے، والدہ، والدہ کی حیثیت سے مدعی تھیں، اور چچا، چچا کی حیثیت سے دونوں طرف سے وکیلوں، اور بیرسٹروں کی خدمات معقول معاوضہ پر حاصل کی گئیں۔ عدالت سے گارجین شپ کا فیصلہ ہونے تک، تمام کام معطل تھے۔ آمدنی

بھی، وصولی بھی، لیکن ضروریات کیونکر معطل کیے جاتے؟ اب پریشانیوں کا دور شروع ہوا، اور اسی موقع پر کھرے دوستوں کی شناخت ہوئی۔ بہتوں سے ہمدردوں نے منہ موڑ لیا، بہت سے دوستوں نے راستہ بدل دیا، بہت سے عزیزوں نے خود بخود اپنی معذوریوں، مجبوریوں اور گراں باریوں کے افسانے سنانے شروع کر دیے، لیکن والد کے جو چند دوست آخر وقت تک اپنی دوستی اور رفاقت میں ثابت قدم رہے، ان میں میرے نزدیک سب سے پہلا درجہ بابو بشمبر ناتھ کا تھا، اس لیے کہ والد کے مسلمان دوستوں کے تعلقات و روابط خاندان کے دوسرے بزرگوں اور عزیزوں سے بھی تھے، انکی رفاقت میں، ان تعلقات کے عناصر شامل تھے، لیکن بابو بشمبر ناتھ، میرے نانا اور دوسرے عزیزوں سے قطعاً غیر متعلق تھے، انہیں صرف والد مرحوم کا خیال تھا،!

گارجین شپ کے مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک اور اس کے بعد بھی، ایک عرصۂ دراز تک بابو بشمبر ناتھ کی دوکان ہماری دوکان تھی، جتنے اور جس قسم کے اور جس قیمت کے کپڑے کی ضرورت ہو صرف ایک رقعہ کافی تھا، دام ہمیشہ دیر میں ملتے تھے، اور کبھی کبھی بعض حالات کے ماتحت خطرہ میں بھی پڑ جاتے تھے، لیکن بابو جی نے جو اصول بنا لیا تھا، اور جو وضع قائم کر لی تھی اس میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، جب مال طلب کیا گیا، بے تامل بھیج دیا، یہ ضرور ہے جب رقم زیادہ ہو جاتی تھی تو وہ پختہ کاغذ لکھا لیتے تھے، اور جب وہ نامزد المیعاد ہونے لگتا تھا، تو اس کی تجدید کرا لیتے تھے، لیکن نہ انھوں نے کبھی مقدمہ کیا، نہ مقدمہ کی دھمکی دی، نہ یاد دہانی کی حد سے آگے بڑھ کر، شدید تقاضہ کی سرحد میں داخل ہوئے، حالانکہ ان کی رقم سیکڑوں کی حد سے تجاوز کر کے، ایک ہزاری منصب کے قریب قریب پہنچ چکی ہوتی تھی۔

مجھے بابو بشمبر ناتھ کا ایک اور واقعہ بھی نہیں بھولتا،!

ہمارے گاؤں کا ایک بیٹی دار، ایک ہمارا ہمسایہ ہندو تھا، اس کا نام چھمن تھا، والد کے انتقال کے بعد بہت سے اور لوگوں کی طرح چھمن نے بھی سر اٹھایا اور شرارتیں شروع کر دیں، نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی، ہمارے مقدمات کی پیروی، بالعموم ہمارے ایک عزیز قاضی حبیب اشرف صاحب بیرسٹر کیا کرتے تھے، لیکن نہ جانے کس وجہ سے اس مقدمہ کی پیروی وہ نہ کر سکے، کچھ بیمار تھے، یا شاید کہیں باہر گئے ہوئے تھے، یاد نہیں، والدہ نے بابو بشمبر ناتھ کو خط لکھا بابو جی کے ایک بھائی وکیل تھے، اور سیتاپور کے اچھے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، فوراً بابو جی نے اپنے بھائی کو اس کام پر مامور کیا، اور انھوں نے اس محنت سے اس مقدمہ کی پیروی کی کہ مقدمہ کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا،

ہمارے ہاں کاروباری سلسلہ میں بابو بشمبر ناتھ کے دستی خطوط اکثر آیا کرتے تھے، خط ہمیشہ وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، بچپن میں تو مجھے احساس نہیں تھا، لیکن شعور حاصل ہونے کے بعد جب میں نے ان کے خطوط کو پڑھا، تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کا اردو خط بہت پختہ تھا، عربی اور فارسی کے الفاظ میں بھی املے کی غلطی ان کے ہاں کبھی نہیں نظر آئی، عربی فارسی کے الفاظ بے تکلف گفتگو اور تحریر دونوں میں استعمال کرتے تھے، اور کیا مجال ہے جو ذرا غلطی کر جائیں، منشی نول کشور کے جاری کردہ، روزنامہ اودھ اخبار، کے مستقل خریدار تھے، اور اس کا پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے،

کچھ عرصہ ہوا، بابو جی کا انتقال ہو گیا، اس کیریکٹر، اور خصلت کے ہندو اب ہندوستان میں کتنے کم ہوتے جا رہے ہیں؟

عبدالحق۔

"باتیں اس کی یاد رہیں گی!"

کسی شاعر کا قول ہے:

گر پیر نود سالہ بمیرد عجبے نیست

مولوی صاحب کی عمر تو ۹۰ سے بھی متجاوز تھی لہٰذا ان کی موت غیر طبعی نہ تھی، پھر بھی ان کی موت اردو زبان کے لیے، ملک کے لیے، قوم کے لیے ایک سانحہ ہے، ایک جگر فگار حادثہ ہے، اب ایسے لوگ کہاں سے پیدا ہوں گے!

میں نے سب سے پہلے مولوی صاحب کو بمبئی میں دیکھا، یہ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔

نواب سر مسعود یار جنگ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے دفعتہً اندرونی سازشوں اور دراندازیوں سے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا، اس واقعہ نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر تھا، کئی پُرزور مقالات افتتاحیہ میں نے مسعود جنگ کی تائید، اور ان کے مخالفین کی مخالفت میں لکھے، موصوف کو یہ مضامین پسند آئے انہوں نے اس زمانے میں کئی خطوط لکھ کر سپاس و ممنونیت کا اظہار کیا، کوشش کی گئی کہ استعفا واپس لے لیں، لیکن وہ اپنے فیصلہ پر اٹل تھے، ایک روز ان کا نامۂ کرم میرے نام آیا۔

"میں بمبئی آرہا ہوں، ایک روز مسٹر اسٹون برج کے ہاں قیام کرکے دوسرے روز پی اینڈ او کمپنی کے جہاز سے لندن روانہ ہوجاؤں گا، آپ اگر وہاں تشریف

سے آئیں تو بہت ممنون ہوں گا! ملنے کو جی چاہتا ہے۔"

یہ خط پاکر میں بہت خوش ہوا۔ سر مسعود جنگ، جسٹس محمود کے بیٹے، سر سید کے پوتے سے ملنے کی تمنا کسے نہ ہوگی۔ جامعہ ملیہ کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، اب ملاقات ہوگی، باتیں ہوں گی، ہندوستان کی ایک بہت بڑی شخصیت سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا۔

آخر وہ دن آیا اور میں سہ پہر کو مسٹر اسٹون برج (یہ ایک انگریز انجنیر تھے) کے دولت کدے پر، جو بیلر ڈیم کے قریب تھا پہنچا۔ نواب مسعود جنگ برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا، تپاک اور گرم جوشی سے ملے، میں نے سوال کیا "لندن آپ کیوں جا رہے ہیں، آپ کی زیادہ ضرورت تو ہندوستان کو ہے!

فرمایا "میرا دل بجھ گیا ہے، اب میں وہیں جاؤں گا، کئی انگریز دوستوں کا اصرار ہے کہ ہم اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں لیکن کوئی کتاب نہیں ملتی۔ تمہاری طرح انگریزی لکھنا ہے تیری کتاب سے، ہم پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

سر مسعود جنگ پر ایک بےیاسی کیفیت طاری تھی، یہ ساری باتیں ٹہل ٹہل کر ہو رہی تھیں۔

میں نے پوچھا "مسلم یونیورسٹی کا کیا حشر ہوگا؟"

فرمایا "اگر یونیورسٹی والوں میں ذرا بھی عقل ہے تو وہ اسماعیل خاں (نواب اسماعیل خاں) کو پکڑیں گے، وہی ایک ایسا ایماندار اور سچا آدمی ہے جو قوم کی اس امانت کی حفاظت کرے۔

بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک صاحب، میانہ قد، سفید شیروانی، ترکی ٹوپی، باریش، سفید تشریف لاتے نظر آئے۔ سر مسعود جنگ دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے اور گویا ہوئے۔

"عبدالحق تم آگئے ؟"

اور ابھی عبدالحق نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سر مسعود جنگ نے معانقہ شروع کر دیا، وہ بھی پوری گرمجوشی سے، عبدالحق دُبلے پتلے سر مسعود جنگ جاری بھر کم، عبدالحق میانہ قد اور سر مسعود جنگ ضرورت سے کچھ زیادہ کشیدہ قامت، پوزیشن تقریباً یہ تھی کہ عبدالحق کا سر نواب مسعود جنگ کے سینے پر ٹکا تھا، دفعتہً وہ جھکے اور انہوں نے عبدالحق کے دونوں گالوں پر باری باری سے بہ آواز بلند بوسہ دیا۔ عبدالحق نے نہایت سعادت مندی سے ایک کے بعد دوسرا گال پیش کر دیا۔ میں اس منظر کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا، حیرت اس بات پر زیادہ تھی کہ دونوں کی عمر میں کافی تفاوت تھا، لیکن بڑے ہونے کے باوجود عبدالحق کچھ مرعوب سے اور چھوٹے ہونے کے باوجود مسعود جنگ بالکل بے تکلف۔ پھر دونوں میں حیدرآباد کی سیاست پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اس گفتگو کے دوران میں مسعود جنگ نے عبدالحق سے میرا تعارف کرایا۔ بات ختم ہو گئی، ملاقات ختم ہو گئی۔

دوسرے روز مولوی صاحب دبے پاؤں میرے دفتر میں تشریف لائے دبے پاؤں اس لیے کہ وہ مولانا شوکت علی سے گھبراتے اور ان سے ملتے ہوئے کتراتے تھے۔ نہ جانے ڈنکے کی چوٹ وہ کیا کہہ بیٹھیں اور انہیں خاموش رہتے بھی نہ بن پڑے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی کیا بات ہو سکتی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے میرے دفتر تشریف لائے تھے میں نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے۔ چند رسمی باتوں کے بعد فرمایا میں جامعہ زبان اردو کا کام کر رہا ہوں۔ بمبئی میں بڑی دشواری پیش آ رہی ہے کیا آپ میری مدد کریں گے ؟ بمبئی کے ایک بااثر بزرگ اور اردو زبان کے شیدائی مسٹر عبدالرحیم ڈسٹمکر کے خلوص کی بہت تعریف کی اور فرمایا آپ کو انہی کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا کیونکہ نیک نیت اور مخلص ہونے کے باوجود وہ عدیم الفرصت رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا میں

ہر طرح حاضر ہوں۔

اب مولوی صاحب سے وقفہ وقفہ کے ساتھ خط و کتابت کا اور جب کبھی وہ بمبئی تشریف لاتے، ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ قاضی عبدالغفار مرحوم جو کسی زمانے میں ہمدرد کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مولانا محمد علی شوکت علی کے نیاز مند خصوص سے تھے۔ حیدرآباد سے اپنا روزنامہ "پیام" نکال رہے تھے جب سے یہ اخبار نکلا تھا بعض بالیسیوں کے باعث وہ مولانا شوکت علی کے خلاف مسلسل لکھتے رہتے تھے کبھی مزاحیہ کالم میں، کبھی ادارتی نوٹ میں۔ ان تحریروں میں نہ صرف وہ حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنی مسلمہ ادبی سطح سے بھی نیچے اتر آتے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اختلاف اصولی نہیں ذاتی تھا۔ میں بھی "خلافت" میں خوب خوب لکھتا تھا۔ اور ترکی بترکی جواب دیتا تھا۔ قاضی صاحب کی ایک کتاب کا نام ہے "اس نے کہا!" میں نے ایک طنزیاتی مقالہ لکھا اور اس کا یہی عنوان رکھا اور دلّی سے لے کر حیدرآباد تک کی کتاب زندگی کے بہت سے دلچسپ اور سبق آموز ورق الٹ دیے۔ اس زمانہ میں مشہور روزنامہ "ملپی تیپلا" کے منیجنگ ڈائرکٹر اور مشہور "دوا اکاسا" کے سول ایجنٹ مسٹر عبدالمجید خواجہ نئے نئے کانگرسی بن کر میدان میں آئے تھے۔ وہ بھی شوکت صاحب کے خلاف زہر چکانیاں کیا کرتے تھے۔ کافی عرصہ تک طرح دینے کے بعد ان کے مکاشفات سیاسی کے جواب میں ایک مضمون میں نے لکھا، جس کا عنوان تھا "اکاسا کا زور!" اتفاق کی بات چند روز کے بعد مولوی صاحب بمبئی آئے اور ملاقات کے موقع پر ایک زوردار قہقہہ لگا کر فرمایا، "تم نے قاضی اور خواجہ کے متعلق جو کچھ لکھا وہ توخیر دلچسپ ہی ہے لیکن "اس نے کہا" اور "اکاسا کا زور" کا جواب نہیں۔

جب مولوی صاحب حیدرآباد سے منتقل ہو کر تشریف لائے اور انجمن کو بھی اپنے ساتھ لائے تو مجھ پر اتنے مہربان ہو چکے تھے کہ میری دو کتابیں "رندِ پارسا" اور "رعایات

اغانی" شائع فرمائیں۔

تقسیم ہند کے بعد میں بھی کراچی آگیا اور مولوی صاحب بھی۔ لیکن وہ اپنی الجھنوں میں مبتلا تھے، میں اپنی مصیبتوں میں گرفتار، عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔

اسی اثنا میں مسٹر شعیب قریشی ماسکو میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے، مولوی صاحب سے اور شعیب صاحب سے بڑے دیرینہ اور گہرے روابط تھے، چنانچہ ان کی الوداعی دعوت کا اہتمام مولوی صاحب نے کیا، سید تقی الدین مرحوم اس زمانے میں مولوی صاحب کی ناک کے بال تھے۔ اور یہ ناک کے بال اکثر بدلتے رہتے تھے۔ غرض سید صاحب اپنے ساتھ مجھے بھی زبردستی لے گئے مولوی صاحب اس طرح ملے جیسے ایک بزرگ خورد سے ملتا ہے۔ دعوت کے اختتام پر مولوی صاحب نے اپنے ایک دیرینہ خدمت گزار کی طرف اشارہ کر کے شعیب صاحب سے فرمایا:

"کچھ اس کی بھی خواہش ہے!"

پھر اپنے ملازم کی طرف دیکھا، اس نے جھٹ سے ایک ہار شعیب صاحب کے گلے میں پہنا دیا، مولوی صاحب رسمیات کے پابند نہ تھے، لیکن جذبات سے بھی ماورا نہ تھے۔

اس دعوت کے بعد کئی بار مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی وہ میرے حالات سے کچھ واقف تھے اور میں زبانِ خاموشی میں گفتگو کا عادی تھا۔ آخر قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم سے مشورہ کے بعد انہوں نے انجمن کی سول ایجنسی مجھے دے دی۔ سول ایجنسی کے متمنی اور بھی کئی لوگ تھے۔ ان کے پاس روپیہ بھی تھا اور وہ قیمت دے کر مال لینے اور مطلوبہ رقم ڈیپازٹ کرنے کو بھی تیار تھے۔ میری شرط یہ تھی کہ ڈیپازٹ کچھ نہیں کر سکتا مال ادھار لوں گا اور قیمت ایک مہینہ کے اندر ادا کر دوں گا۔ مولوی صاحب نے زرداروں کو ٹھکرا دیا اور ایک بے بضاعت شخص کو قبول فرما لیا اور اصول کا اتنا لحاظ رکھا کہ جو کتابیں

براہِ راست فروخت ہوتی تھیں، ان کا کمیشن بھی میرے حساب میں درج ہو جاتا تھا۔

پھر میں روزنامہ زمیندار کا چیف ایڈیٹر ہو کر لاہور چلا گیا، یہاں متعدد مواقع پر میں نے انجمن اور مولوی صاحب سے متعلق کئی مضامین لکھے۔ ایک خط میں مولوی صاحب نے مجھے لکھا:

"سنا ہے سعید سہگل بھی قومی اور ملی کاموں میں روپیہ دے ڈالتا ہے۔
آپ مجھے لاہور بلاتے ہیں میں آنے کو تیار ہوں، لیکن انجمن کے لیے
اس کی مالی حالت بہت سقیم ہے!"

میں نے ایک "اردو کانفرنس" منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ مجلس استقبالیہ کے کئی ممبر بھی منتخب کر لیے، لیکن بعض وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ ارادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ مولوی صاحب مسلسل ابتلا کے دور سے گزرتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ان کا ذاتی کتب خانہ تک مقفل کر دیا گیا، مجھ پر اس زمانے میں قلبی حملہ بہت شدید ہوا تھا۔ میں نے انہیں لکھا، گو ڈاکٹر اب تک مجھے بستر سے اٹھنے نہیں دیتے لیکن میں کراچی آ کے، ور کتب خانہ کیلئے تنتیہ گرہ کرنے کو تیار ہوں!"

فوراً مولوی صاحب کا جواب آیا:

"آج میں نے جانا کہ دنیا میں میرا بھی کوئی ہے، میں آپ کو خودکشی کی اجازت نہیں دے سکتا، آپ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کیجیے۔ یہ میرا حکم ہے!"

پھر کچھ عرصہ بعد جب میری صحت کسی حد تک بحال ہوئی تو میں کراچی آیا، مولوی صاحب سے ملنے کی تمنا بیتاب کیے ہوئے تھی، لیکن وہ بالائے بام رہتے تھے اور مجھے ڈاکٹروں نے دس سے زیادہ سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ اپنی اس مشکل کا میں نے مولوی صاحب کے ایک عزیز اور معتمد رفیق کار سے ذکر کیا، انھوں نے اپنے دوست کے

پر ناظم آباد میں رات کے کھانے پر مجھے اور مولوی صاحب کو مدعو کر لیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ رات کو مولوی صاحب آسکیں گے، لیکن وہ مجھ سے پہلے پہنچ گئے۔ کھانے کے دوران میں اور کھانے کے بعد تقریباً گیارہ بجے رات تک جی کھول کر مختلف معاملات و مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی صاحب کی موٹر بک چکی تھی، ایک لکشا میں اپنے پٹھان ملازم کے ساتھ وہ واپس تشریف لے گئے۔!

اس کے بعد پھر کئی مرتبہ کراچی جانا ہوا، لیکن کچھ ایسی الجھنوں میں مبتلا رہا کہ مولوی صاحب کی خدمت میں نہ حاضر ہو سکا اور اب ریڈیو کی زبان نے یہ خبر سنائی کہ وہ اس خاکدانِ عالم سے عالمِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ رہے نام اللہ کا۔!

مولوی صاحب مر گئے، لیکن اپنے ملنے والوں اور جاننے والوں کے حلقے میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس وقت وہ گویا میری نظر کے سامنے ہیں، تنا ہوا سینہ چاہے کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں۔ تحریر اس بڑھاپے میں بھی صاف اور دل کش حروف ایسے مضبوط جیسے لوہے کے قلم سے گڑھ کر لکھے گئے ہوں، وہ مر گئے لیکن کیا اُن کا یہ بانکپن بھی مر سکتا ہے؟ ہائے کس سے پوچھوں۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

دیکھا چاہیے اب انجمن کا کیا حشر ہوتا ہے؟

مولانا بخاری — کچھ یادیں

معجزہ اہلِ فکر فلسفۂ پیچ پیچ !
معجزہ اہلِ ذکر، موسیٰ و فرعون و طور

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہا!

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی!

لیکن یہ "آبِ بقائے دوام" کس کو ملا جو بخاری کو مل جاتا؟ — جب احمد مرسلؐ نہ رہے کون رہے گا؟

مولانا بخاری بہت بڑے عالم نہیں تھے، نہ مفسر نہ محدث، نہ فقیہہ نہ متکلم لیکن وہ بڑے انسان ضرور تھے، ان میں قلندرانہ صفات تھے، درویشانہ ادائیں اور فقیرانہ جلال!

مولانا سیاست کے میدان میں ایک سیاست دان کی طرح نہیں آئے تھے، نہ انہیں ہندوستان کے آئندہ دستور سے دلچسپی تھی، نہ تحفظِ حقوقِ مسلمین کے لیے وہ کانگریس سے لڑنے پر آمادہ تھے، نہ ہندو مسلم کشمکش سے انہیں کچھ زیادہ سروکار تھا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر انگریز اس ملک سے نکل جائیں انگریزوں سے، انگریزی سامراج سے، انگریزوں کی ہر چیز سے انہیں نفرت تھی۔ وہ کانگریس کی مسلم آزاری کو بھی اس لیے برداشت کرتے اور اس سے آمادۂ تعاون ہو جاتے تھے

کہ ان کے نزدیک وہ انگریزوں کو نکالنے کی جدوجہد کر رہی تھی، ان کا خیال تھا جب تک انگریز اس دیس سے نہیں نکالے جاتے اس وقت تک نہ عالم اسلام آزاد ہو سکتا ہے، نہ یہ ملک۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ غیر مشروط طور پر ہر مخالف برطانیہ تحریک میں پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ شریک ہوئے۔ علی برادران جب تک کانگریس کے ساتھ تھے مولانا ان کے نیازمند، رفیق اور ہم قدم بنے رہے، جب معلوم و معروف وجوہ سے انہوں نے کانگریس سے کنارہ کشی کی تو مولانا ان سے الگ ہو گئے لیکن اس علیحدگی کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ محمد علی اور شوکت علی کے خلوص، حب وطن اور جذبۂ ملی کے قائل نہ تھے۔ ضرور قائل تھے، لیکن انہوں نے اپنے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ دوسری تھی اور وہ اپنا سوچا سمجھا راستہ بدلنے کو تیار نہیں تھے۔

گول میز کانفرنس (۱۹۳۰ء) میں جب اپنی ولولہ انگیز حریت آفریں اور روح پرور مگر آخری تقریر کرنے کے بعد مولانا محمد علی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو دلی کی جامع مسجد میں ایک مرتبہ نماز جمعہ کے بعد مولانا نے رو رو کر ایک تقریر کی۔ آنسو ان کی آنکھوں سے جاری تھے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی، گریہ گلو گیر ہو رہا تھا اور وہ تقریر کر رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس تقریر میں مولانا نے بڑے درد اور سوز کے ساتھ فرمایا تھا "محمد علی کا سا سپوت صدیوں میں کوئی ماں جنتی ہے۔" یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ مولانا کے بالکل یہی الفاظ تھے۔

مولانا کے یہ الفاظ ان کے خلوص اور سچائی کا آئینہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے محمد علی کے تعلقات مولانا بخاری سے اور نہ صرف مولانا بخاری سے بلکہ جمعیت علماء ہند کے تمام اکابر سے۔ کیونکہ سب کا مسلک یہی تھا۔ انتہائی تلخ اور کشیدہ ہو چکے تھے، تقریروں میں اور تحریروں میں نہایت سختی اور شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے افکار و نظریات کا احتساب کیا جاتا تھا اور اس سختی اور شدت میں

تلخی اور بدمزگی نمایاں طور پر جھلکتی تھی، مولانا محمد علی بھی کچھ کم نہیں تھے، جس سے مخالفت ہوجاتی اس کی تحلیل اور تجزیہ میں وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے چنانچہ انہوں نے بخاری اور مسلم موضوع پر جو کچھ کہا اور لکھا وہ تاریخ سیاست ہند کا نہایت دلچسپ باب ہے۔ لیکن اس شدید تلخی اور سخت اختلاف کے باوجود محمد علی بھی مولانا بخاری کے خصائص، امتیازات اور صفات کے قائل تھے اور اعتراف میں ذرا بھی بخل روا نہ رکھتے تھے مولانا بخاری ایک شعلہ بیان اور آتش فشاں اور سحر طراز واعظ بھی تھے، وہ تقریر شروع کرتے تو بڑے سے بڑا مجمع — خواہ وہ مخالفوں کا کیوں نہ ہو — دم بخود ہوجاتا، ان کی تقریر میں وہ روانی، وہ شگفتگی، وہ حلاوت اور وہ تاثیر تھی کہ جو لوگ مخالفت کا ارادہ کرکے جاتے وہ اس وقت چونکتے جب تقریر ختم ہوچکتی اور یہ تقریر مختصر نہ ہوتی۔ اگر اسے تقریر شبینہ کے نام سے یاد کیا جائے تو ذرا سا مبالغہ نہ ہوگا، وہ عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کے وقت ختم کرتے۔ آندھی آئے، پانی برسے، قیامت تک کیوں نہ گزر جائے لیکن مولانا کے سامعین اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرتے کسی کی آنکھ میں جادو تیرے بیان میں ہے" اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی جادو بیانی ایک مسلم حقیقت تھی۔

لاہور کے ایک متعصب اور گندہ ذہن آریہ سماجی راجپال نے ایک انتہائی اشتعال انگیز کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) لکھی، اس کتاب نے سارے پنجاب میں تہلکہ مچا دیا۔ خاص طور پر لاہور تو میدان قیامت بن گیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ مقدمہ عدالت عالیہ میں گیا اور جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کو بری کر دیا۔ اس فیصلہ نے اور زیادہ قیامت برپا کر دی، زمیندار اور بعض دوسرے اخبارات نے "دلیپ سنگھ مستعفی ہوجاؤ" عنوان سے کئی مقالات لکھے نتیجہ یہ ہوا کہ ——— ان کے ودنام میں یہ لوگ ماخوذ اور سزایاب ہوئے۔

مولانا محمد علی نے ہمدرد میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس کا عنوان تھا تصور قاضی کا

نہیں تھا قانون کالا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا تعزیراتِ ہند میں ایسی کوئی مؤثر دفعہ موجود نہیں ہے جس کی رو سے راجپال جیسے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے، دلیپ سنگھ نے اگر سزا دے بھی دی ہوتی تو کورٹ اور جج اسے رہا کر دیتا، لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہیے کہ تعزیراتِ ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا جائے جس کی رو سے بزرگانِ دین کی توہین کرنے والے کو مستوجبِ سزا قرار دیا جائے۔

محمد علی کے اس مضمون نے اور زیادہ آگ لگا دی۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ چونکہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دلیپ سنگھ ان کے ہم درس رہے ہیں لہٰذا وہ ان کا ساتھ دے رہے ہیں، یہ بات بالکل غلط تھی محمد علی ان لوگوں میں تھے کہ خود بقول ان کے "اگر شوکت بھی حق کے خلاف قدم اٹھائیں تو میں پستول میں دو گولیاں بھروں گا، ایک سے شوکت کا کام تمام کر دوں گا دوسری اپنے مار لوں گا، کیونکہ ان کے بعد زندہ رہنا میرے لیے بیکار ہے۔ بھلا ایسا شخص اتنے بڑے اور اہم معاملہ میں انتہائی مذہبی بلکہ مذہبی مجنوں ہونے کے باوجود کس طرح دلیپ سنگھ کا ساتھ دے سکتا تھا۔ بات وہی ٹھیک تھی جو انہوں نے لکھی تھی چنانچہ بعد میں تعزیراتِ ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ بھی کیا گیا۔ غرض سارا لاہور محمد علی کے خلاف بھرا ہوا تھا اسی حالت میں وہ لاہور گئے اور ایک جلسۂ عام میں تقریر کی اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ محمد علی کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ قانون کو جذبۂ عام کے بہاؤ میں نہیں بہنا چاہیے، بلکہ اس کی تشکیل کرنی چاہیے، اور اپنی ہر دلعزیزی کی بھینٹ دے کر وہ اسی پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے اور بالآخر کامیاب بھی ہوتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جو لوگ محمد علی کو قتل کرنے آئے تھے وہ محمد علی زندہ باد کے نعرے لگاتے واپس گئے۔ اس جلسے میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک بڑی اثر انگیز اور معرکہ آرا تقریر کی جادو بیانی اور سحر طرازی کی پوری شان کے ساتھ مولانا محمد علی نے انہیں گلے لگا لیا، اور کہا تمہاری یہ سحر بیانی اللہ کی دین ہے لیکن یاد رکھو یہ دو دھاری تلوار ہے جس طرح یہ حق کے لیے چل سکتی ہے اسی

طرح باطل کے لیے بھی چل سکتی ہے اور وہ ہزاروں لوگ جو تم سے متاثر ہوں گے، تمہارا ساتھ دیں گے ان کی ذمہ داری صرف تم پر ہوگی خبردار اس جوہر کا غلط استعمال کبھی نہ کرنا۔

مولانا اپنے راستہ پر چلتے رہے، پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان کے قدم آگے کی طرف بڑھتے رہے، انہیں نہ محمد علی سے غرض تھی، نہ مجلس خلافت سے، نہ وہ قائد اعظم سے واسطہ رکھتے تھے نہ مسلم لیگ اور اس کے اغراض و مقاصد اور منزل مقصود سے وہ جب ضرورت دیکھتے ان سب سے الجھ بھی پڑتے، وہ اپنی دھن میں مست تھے وہ انگریزوں کے اخراج سے پہلے کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن — لیکن جب انگریز اس دیس سے نکلے تو مولانا کو بھی اپنے وطن سے نکلنا پڑا، وہ اپنے وطن میں نہ رہ سکے، جہاں کی فضائیں ان کی شعلہ مقالی سے لرزتی رہتی تھیں، جہاں کے در و دیوار ان کی آتش نوائی سے گونجا کرتے تھے، جہاں کے بام و ایوان ان کے زور سخن سے کانپا کرتے تھے، جہاں انہوں نے دکھ جھیلے تھے، تکلیفیں اٹھائی تھیں، اذیتیں برداشت کی تھیں، سجن و زنداں کو لبیک کہا تھا اور دار و رسن کے لیے آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ وہی سرزمین، وہی فضائیں، وہی در و دیوار اور وہی بام و ایوان ان سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے اب یہ تمہارا وطن نہیں ہے، اب یہ تمہاری سرزمین نہیں ہے، اب تم یہاں اجنبی ہو، اب تم یہاں بدیسی ہو، چلے جاؤ، نکل جاؤ، بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارے جسم و جان کا رشتہ منقطع کر دیا جائے گا۔

مولانا کے پاس تھا کیا؟ — قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔ لکڑی ہاتھ میں لی کوٹلی بغل میں دبائی، اور بے وطن ہو کر لاہور آ گئے۔ پھر ملتان چلے گئے اور اب وہاں کے سفر پر روانہ ہوئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

مولانا بہر حال ہمارے تھے، اختلاف فکر و نظر کے باوجود ہمارے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال پر ہر مسلمان رویا اور ان رونے والوں میں بہت بڑی اکثریت ان کی

تھی جو ان سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن کتنے تعجب، کتنی حیرت اور کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان کی لوک سبھا نے رنج و افسوس کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کیا پنڈت نہرو مولانا کو بھول گئے؟ کیا کانگریس نے مولانا کو فراموش کر دیا؟ — اس قدر جلد؟ جبکہ ان کی حریت مآب اور سامراج شکن تقریروں کی صدائے دل پذیر اب بھی ہندوستان کی ہر گلی اور ہر کوچہ میں گونج رہی ہے؟

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مولانا حفیظ اللہ

افسوس تم کو میرے صحبت نہیں رہی

دار العلوم ندوۃ العلما کے مہتمم تھے، شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب، دراز ریش
دراز قد، مذہب اہل حدیث پر عامل تھے، لیکن، ملک کے سب سے بڑے حنفی عالم
مولانا عبد الحی فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے۔ استاد کے مسلک سے متفق نہیں تھے
لیکن عظمت کے قائل تھے، مولانا نے انھیں جو سند مرحمت فرمائی تھی وہ سورۂ فاتحہ
کی طرح انھیں زبانی یاد تھی، جب موج میں ہوتے تھے، فرفر سنا دیتے تھے، کیا مجال
جو کہیں اٹک جائیں یا متشابہ لگ جائے، منطق، فلسفہ، اور ہیئت ان کا خاص
موضوع تھا، دور دور سے ان فنون پر لوگ ان سے اپنی مشکلات حل کرنے کے
لیے تشریف لاتے تھے، عمر سال اتنے زیادہ تھے کہ مولانا سید سلیمان ندوی
ان کے سامنے ان کے بچے تھے، شاگرد بھی تھے، اور یہ اپنے حق استادی سے کبھی
حالت میں دستبردار نہیں ہوتے تھے، حالانکہ یہ صرف مہتمم تھے، اور وہ دار العلوم کی
مجلس انتظامیہ کے رکن رکین، اور مجلس انتظامیہ کی طرف سے معتمد تعلیمات!

میں نے جب انھیں دیکھا، تو عمر، تقریباً اسی سال کی تھی، لیکن بلے تھلے سے
ہوتا تھا۔ نام خدا ابھی جوان ہیں۔ اگر یہ خضاب لگاتے ہوتے تو ان کی عمر کا
صحیح اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا تھا، ممکن تھا، یہ خود بھی مغالطہ میں گرفتار ہو جاتے

نماز کے بڑی سختی سے پابند تھے، دسمبر اور جنوری کی سردی میں ٹھنڈے پانی سے فجر کا وضو کرتے تھے۔ اور اوّل وقت میں، یعنی بالکل غلس میں اذان دیتے تھے، پھر نماز پڑھاتے تھے، ان کی فجر کی نماز میں تراویح کا لطف آجاتا تھا، تقریباً، ایک ایک پارہ ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے، جو لوگ ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے لیے ضروری تھا کہ نماز فجر میں ان کا ساتھ دیں، لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جب یہ نماز شروع کرتے تھے، تو مشکل سے دو تین آدمی ان کے ساتھ نیت باندھتے تھے۔ لیکن جب سلام پھیرتے تھے تو پوری صف موجود ملتی تھی، لوگ ان کی نماز کی طوالت سے واقف تھے، انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ کب یہ دوسری رکعت کے رکوع میں جانے کے قریب ہوتے ہیں؟ بس اسی وقت وضو یا تیمم کر کے، جیسا موقع ہوا، شریک جماعت ہو جاتے تھے، ایک رکعت تھا۔ ایک ادا، ! مولانا سجدہ اتنا طولانی کرتے تھے کہ بعض لوگ ایک نیند اطمینان سے لیتے تھے، اکثر یہ تماشہ دیکھنے میں آتا تھا کہ یہ اپنے طویل سجدہ سے فارغ ہو کر بیٹھے، لیکن بعض مقتدی بدستور سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں، نماز کے بعد جب وہ جگائے جاتے تھے۔ تب ان کا سجدہ ختم ہوتا تھا!

مجھ پر مہربان بھی بہت رہتے تھے، اور خفا بھی بہت ہوتے تھے، مہربان تھے میرے خاندان کی وجہ سے، اور خفا رہتے تھے میری شرارتوں سے، مولانا عبدالحق خیرآبادی، منطق اور فلسفہ کے امام تھے، اب تک اُن کی کتابیں مدارس عربیہ کے نصاب میں شریک ہیں، یہ مولانا عبدالحق مرحوم کو اپنا مدمقابل سمجھتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خواہ مخواہ تنقیص پر اتر آتے تھے، میں سنتے سنتے کہہ اٹھتا، مولانا عبدالحق جیسے فضل و کمال کا شخص اب تک ہوا ہے نہ آئندہ پیدا ہوگا، بس پھر مولانا کس کی سنتے ہیں، آگیا جلال، دو چار کڑوی کسیلی باتیں مجھے

سنائیں، کچھ دیر مولانا عبدالحق پر برسے، پھر اپنے "تاریخی" مناظروں کے قصے سنانے لگے، گھنٹہ بجا اور میرا مقصد حل ہو گیا، یعنی، درس، نذر داستان، کبھی کبھی میری اس چالاکی کو سمجھ جاتے تھے۔ لیکن اکثر اسیر دام ہو جاتے تھے۔

علامہ شبلی مرحوم سے، ان کی زندگی میں یہ چھیڑ رکھتے تھے۔ چھیڑ کا سلسلہ، علامہ کی وفات کے باوجود اب تک قائم تھا۔ انھیں جاہل مطلق سمجھتے تھے۔ جب میں ان کی زیادہ تعریف کرتا تو فرماتے، اگر میں کسی زمین پر پیشاب کر دوں، اور وہاں گھاس اگ آئے، اور اس گھاس کو کوئی گدھا چر جائے، تو وہ آپ کے علامہ شبلی کو کم از کم ایک صدی تک درس دے گا۔

علم و فضل کو جانے دیجئے، مولانا شبلی کی اردو دانی، انشا پردازی، اور مہارت تحریر کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کی نظر میں، مولانا شبلی سے بڑھ کر کور ذوق، اور ناواقف ادب کوئی نہیں تھا۔ شعرالعجم مہمل موازنۂ انیس و دبیر مہمل تر، اور پھر انیس دبیر، اور فارسی شعرا کے شعر پر شعر سنانا شروع کر دیتے، اور فرماتے، جو شخص ایسے اشعار آبدار کو نظر انداز کر جائے وہ ادیب ہے، ؟ اور واقعی مولانا شبلی کی صد میں انھوں نے دیوان کے دیوان زبانی یاد کر لیے تھے۔

حافظہ آخر عمر تک بہت اچھا، بلکہ قابل رشک رہا، لیکن قوت حافظہ کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً کتاب کا صفحہ ۵۰ پڑھا رہے ہیں، ہوا چلی اور اب ان کی نظر کے سامنے ۷۳ واں صفحہ ہے، یہ وہاں سے درس شروع کر دیں گے، اب لاکھ سر پٹخئے، سبق یہاں سے نہیں وہاں سے ہے مگر یہ ہرگز نہیں مانیں گے۔ زیادہ اصرار کیجئے تو کتاب بند کر کے اٹھ کھڑے ہوں گے، اور درجہ سے دفتر واپس چلے جائیں گے کہ تم لوگ اس قابل نہیں کہ تمھیں پڑھایا جائے۔

نالائق، بدشوق، کم ذوق، بے سواد'!

بڑھاپے کے باوجود، چھ گھنٹے ڈٹ کر کرسی پر بیٹھتے تھے، کیا مجال، جو کمر میں کہیں خم نظر آجاتے، یہ معلوم ہوتا تھا کرسی پر مولانا حفیظ اللہ نہیں بیٹھے ہیں، نیزہ گڑا ہوا ہے'!

نماز کے بعد "برطانیہ" کے تباہ و برباد ہونے کی "دعائے بالجہر" ضرور مانگتے تھے، اور فجر کی نماز کے بعد خاص طور پر، لیکن "شمس العلماء" کا خطاب طلبہ اور معتقدین کے اصرار کے باوجود واپس نہیں کیا'!

بہت بڑے عالم تھے، علوم اسلامیہ پر بڑی گہری نظر تھی، حدیث اصول حدیث، منطق، فلسفہ، اور ہیئت کے تو گویا امام تھے، لیکن جبہ اور عمامہ سے کبھی شوق نہیں فرمایا، تنگ مہری کا پاجامہ اور اس پر شیروانی، لیکن پاجامہ ٹخنے سے اوپر رہتا تھا، اس سے لوگ پہچانتے تھے یہ اہل حدیث ہیں'!

تقریباً سو سال کی عمر، ہیں، چند سال کی مدت گزری انتقال فرمایا۔

(ستمبر ۱۹۵۱ء)

اردو بھی بہت اچھی اور ستھری لکھتے ہیں، ایک خاص طرز بیان کے موجد ہیں۔ ان کی اردو میں عربی طرز بیان کے امتزاج نے بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے، الفاظ پرشکوہ نہیں ہوتے لیکن اتنے میٹھے اور سبک ہوتے ہیں کہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں، انکی کتابیں لکھو چکے ہیں، اور ہر کتاب اپنی معنویت اور افادیت کے لحاظ سے اہم ہے"!

ایک مرتبہ دلی میں سردار دیوان سنگھ مفتوں سے ملاقات ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ میں جامعہ ملیہ میں پڑھ رہا تھا، اور سردار صاحب اس فکر میں تھے کہ ملیح آبادی صاحب کو ریاست کا ایڈیٹر بنا لیں، اس سلسلہ میں مولانا سے خط کتابت براہ راست یا بالواسطہ کر رہے تھے، دوران گفتگو میں کہنے لگے، مولانا ملیح آبادی، شذرات اور مقالات کے عنوانات ایسے رکھتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا بھی اشتیاق کے ساتھ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہ بات میرے دل پر نقش ہو گئی، اور واقعی میں نے اپنے تجربہ میں بھی وہی بات پائی، جو مفتوں صاحب نے کہی تھی۔

ملیح آبادی صاحب بڑے جذباتی آدمی ہیں، مولانا شوکت علی کی مخالفت میں ان کا اخبار وقف تھا، اور، یہ کوئی کسر ان کی مخالفت میں اٹھا نہیں رکھتے تھے، ملائم اور ناملائم، مناسب اور غیر مناسب، درست یا نادرست، سب ہی کچھ لکھ ڈالتے تھے، مولانا کلکتہ پہنچے، اختلاف کے باوجود، مولانا ابوالکلام کے ہاں پہنچے، اور بیگم ابوالکلام کی ٹھاٹھ دار دعوت سے فارغ ہو کر، اپنے سب سے بڑے مخالف، ملیح آبادی صاحب کے دفتر آ گئے، مولانا کو دیکھ کر ملیح آبادی صاحب دنگ ہو گئے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس کی شد و مد سے وہ مخالفت کر رہے ہیں وہ خود ان سے ملنے چلا آئے گا، شوکت صاحب نے انھیں گلے سے

لگایا، یہ سر جھکا کر بندۂ بے دام بن گئے، اور دو کالم کا مقالہ شوکت صاحب کی تشریف آوری پر سراپا جذبات بن کر لکھ ڈالا، شوکت صاحب کی یہی ادائیں تھیں جن سے وہ دشمنوں کو دوست بنایا کرتے تھے، !

(جولائی ۱۹۵۵ء)

شاہ معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین کا گوہر یک دانہ!

بہت دنوں کی بات ہے، ندوہ کے درجاول میں میرا داخلہ ہوا، ایک صاحب درجہ ہفتم میں پڑھتے تھے، خوش رُو، خوش اندام، خوش وضع اور خوش اخلاق۔ پان کھاتے تھے، تو اس وضع سے کہ:

دیکھئے اے ذوق ہر تا آج ہے کس کس کا خوں!
پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا

میں چھوٹا یہ بڑے، میرے ان کے درمیان ملاقات کی نوبت کا ہے کو آتی لیکن جذبِ دل کہیے یا حسنِ اتفاق کہ انجمن الاصلاح کے ناظم دارالکتب مقرر ہوئے، عصر کے بعد کا وقت پابندی کے ساتھ لائبریری میں مستقل طور پر صرف کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے کہ حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ضرورت ہوئی ایک فرماں بردار اطاعت شعار نائب کی، ایسا نائب ان کے ہم عمر اور ہم جماعت لڑکوں سے ملنا ناممکن تھا، انہوں نے سوچا کسی چھوٹے درجہ کے لڑکے کو پھانسنا چاہیے۔ رعب کا رعب اور کام کا کام، مجھے بچپن ہی سے کتابوں سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں اکثر لائبریری آیا جایا کرتا تھا۔ نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی، اور انہوں نے مجھے اپنا نائب منتخب کر لیا، خود مجلس طرازیاں کرتے تھے اور میں پابندی سے دو گھنٹے کتابوں کی داخل خارج کا کام کرتا تھا۔ میری کارگزاری سے بہت خوش ہوئے

اکثر شاباش دیا کرتے تھے۔

ندوہ میں تحقیقی زندگی سے انہیں کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا، لیکن سند فراغت حاصل کرنے کے بعد دارالمصنفین پہنچے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت تحریر و مطالعہ کا کام شروع کیا۔ سید صاحب کا معاملہ وہ ہے کہ:

یہ سوئے خوشۂ عنب نگاہ کس کی جا پڑی
جو دانہ جس جگہ پڑا وہیں شراب بن گیا

چند ہی سال میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی پیدا ہوئی اور ایسی تاریخی اور مذہبی کتابیں لکھیں کہ مخالفوں نے بھی داد دی۔ ادبی ذوق ندوہ کے دور طالب علمی ہی سے نکھرا ہوا تھا۔ علمی کمال سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔ اب دارالمصنفین کے اساطین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سید صاحب مغفور جب نقل وطن کرکے پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں مستقل قیام فرمایا۔ میں بھی وہیں تھا، وقت نکال کر کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ سید صاحب کو اس زمانے میں تلاوت کلام پاک سے بے حد شغف پیدا ہو گیا تھا۔ ایک روز میں حاضر ہوا، وہ تلاوت فرما رہے تھے، آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ میں پاس ہی بیٹھ گیا، تاز "معارف" سامنے پڑا تھا اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تلاوت سے فارغ ہوئے۔ میں نے معارف پھر وہیں رکھ دیا۔ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا:

"کیا پڑھا؟"

شاہ معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین کا گوہر یک دانہ!

بہت دنوں کی بات ہے، ندوہ کے درجہ اول میں میرا داخلہ ہوا، ایک صاحب درجہ ہفتم میں پڑھتے تھے، خوش رُو، خوش اندام، خوش وضع اور خوش اخلاق۔ پان کھاتے تھے، تو اس وضع سے کہ:

دیکھئے اے ذوق ہوتا آج ہے کس کس کا خوں!
پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا

میں چھوٹا یہ بڑے، میرے ان کے درمیان ملاقات کی نوبت کا ہے کو آتی لیکن جذبِ دل کہیے یا حسنِ اتفاق کہ انجمن الاصلاح کے ناظم دارالکتب مقرر ہوئے، عصر کے بعد کا وقت پابندی کے ساتھ لائبریری میں مستقل طور پر صرف کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے کہ حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ضرورت ہوئی ایک فرماں بردار اطاعت شعار نائب کی، ایسا نائب ان کے ہم عمر اور ہم جماعت لڑکوں سے ملنا ناممکن تھا، انہوں نے سوچا کسی چھوٹے درجہ کے لڑکے کو پھانسنا چاہیے۔ رعب کا رعب اور کام کا کام۔ مجھے بچپن ہی سے کتابوں سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں اکثر لائبریری آیا جایا کرتا تھا۔ نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی، اور انہوں نے مجھے اپنا نائب منتخب کر لیا، خود مجلس طرازیاں کرتے تھے اور میں پابندی سے دو گھنٹے کتابوں کی داخل خارج کا کام کرتا تھا۔ میری کارگزاری سے بہت خوش ہوئے

اکثر شاباش دیا کرتے تھے۔

ندوہ میں تحقیقی زندگی سے انہیں کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا، لیکن سند فراغت حاصل کرنے کے بعد دارالمصنفین پہنچے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت تحریر و مطالعہ کا کام شروع کیا۔ سید صاحب کا معاملہ وہ ہے کہ:

یہ سوئے خوشۂ عنب نگاہ کس کی جا پڑی
جو دانہ جس جگہ پر تھا وہیں شراب بن گیا

چند ہی سال میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی پیدا ہوئی اور ایسی تاریخی اور مذہبی کتابیں لکھیں کہ مخالفوں نے بھی داد دی، ادبی ذوق ندوہ کے دور طالب علمی ہی سے نکھرا ہوا تھا۔ علمی کمال سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔ اب دارالمصنفین کے اساطین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سید صاحب مغفور جب نقل وطن کرکے پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں مستقل قیام فرمایا۔ میں بھی وہیں تھا، وقت نکال کر کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ سید صاحب کو اس زمانے میں تلاوت کلام پاک سے بے حد شغف پیدا ہو گیا تھا۔ ایک روز میں حاضر ہوا، وہ تلاوت فرما رہے تھے، آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ میں پاس ہی بیٹھ گیا، تاز "معارف" سامنے پڑا تھا اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تلاوت سے فارغ ہوئے۔ میں نے معارف پھر وہیں رکھ دیا۔ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا:

"کیا پڑھا؟"

نجیب اشرف ندوی

کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!

ندوی ہیں، ایم اے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ، بے انتہا بذلہ سنج اور خوش مذاق، عربی اچھی خاصی جانتے ہیں، اردو کے ادیب بے بدل ہیں، فارسی پر بڑی گہری نظر ہے، ایک زمانہ میں ان سے اور نیاز فتحپوری سے بڑی پرنور ادبی جنگ ہوتی، کسی کام سے لکھنؤ آئے، ندوہ میں ٹھہرے، غرارے دار پاجامہ تن زیب کا انگرکھا، سر پر بہترین دوپلی ٹوپی، باتوں میں شوخی، انداز و اطوار میں طراری ہنستے کم ہیں، ہنساتے زیادہ ہیں، ندوہ کے اوپر کے حصہ میں ٹھہرے تھے، میں چھوٹے درجہ کا ایک معمولی طالب علم تھا، دور سے نظارہ کیا، طبیعت بہت خوش ہوئی کہ ایسے آزاد مشرب ندوی بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے دن نیاز صاحب نے ان کی ایک پُر تکلف دعوت کی، پہلی مرتبہ معلوم ہوا، اختلاف و مجادلہ کے میدان میں دعوت کا دسترخوان بھی بچھ سکتا ہے۔

کئی برس گزر گئے، اب میں ندوہ کے ایک اونچے درجہ کا طالب علم تھا، میں نے اور عبدالسلام صاحب قدوائی (صاحب ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ) نے پروگرام بنایا، چند روز کے لیے دارالمصنفین اعظم گڑھ چلنا چاہیے۔ دیکھیں وہاں کی علمی اور مذہبی فضا کا کیا رنگ ہے؟ وہاں کے بلند بام مشائخ کے رہنے سہنے کا

کیا ڈھنگ ہے؟ رسول اکرمؐ کا یکتا سیرت نگار کس طرح رہتا ہے؟ خلفائے راشدینؓ کے سوانح نویس، دن کیونکر بسر کرتے ہیں؟ کام کرنے کا کیا اسلوب ہے؟ تاریخ اسلام اور حقیقت اسلام کے متبع اور نقاد، رمز شناس، اور ماہر، اٹھتے بیٹھتے کس طرح ہیں؟ رہتے سہتے کس طرح ہیں؟ بات چیت کرنے کا کیا ڈھنگ ہے؟ غرض ایک والہانہ جوش تھا، جو اعظم گڑھ لیے جا رہا تھا۔

ہم ناخواندہ مہمانوں کا چھوٹا سا قافلہ دار المصنفین کی خانقاہ میں پہنچا، مولانا سید سلیمان نے وقار اور رعب کے ساتھ پذیرائی کی، مولانا مسعود علی ندوی نے رکھ رکھاؤ کے ساتھ استقبال کیا، وہی رکھ رکھاؤ جو بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان ہوتا ہے مولانا عبد السلام ندوی نے پروا بھی نہ کی کون آیا؟ اور کیوں آیا؟ ان کی فلسفیانہ بے خودی اس قسم کے معاملات پر غور و فکر کی اجازت ہی نہیں دیتی، مولانا ریاست علی ندوی، اور مولانا معین الدین احمد ندوی بھی جی کھول کے ملے، لیکن بڑے پن کے ساتھ جیسے بڑا بھائی، چھوٹے بھائی کے ساتھ ملتا ہے، لیکن نجیب اشرف صاحب بغیر کسی سابقہ ملاقات اور تعارف کے اس محبت، اس بے تکلفی، اور اس تپاک سے ملے جیسے برسوں کی ملاقات ہے، وقت کا بڑا حصہ، ہم نو واردوں کے ساتھ بسر کرتے، مزے مزے کی باتیں کرتے، اور باتوں باتوں میں ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ کرتے، ادبی، علمی، سیاسی ہر موضوع پر گفتگو کرتے، لیکن ایسی پر لطف، اور بامزہ کہ جی چاہتا باتیں کیے جائیں، اور شب ہجراں کی طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو،

اب کھانے کا وقت آیا، اور پہلا تجربہ بڑا خطرناک ہوا، ہم دونوں ٹھہرے ایک خوش خور، اور یہاں یہ حالت کہ سید صاحب نے دو لقموں کے بعد ہاتھ اٹھا لیا، مولانا مسعود علی نے بھی دو تین لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا، دوسرے لوگ کھاتے رہے، یہ رنگ دیکھ کر ہم نے سید صاحب کی تقلید میں: بادل نخواستہ

نجیب اشرف ندوی

کہ ہے ظریف وخوش اندیشہ وشگفتہ دماغ!

ندوی ہیں، ایم اے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ، بے انتہا بذلہ سنج اور خوش مذاق، عربی اچھی خاصی جانتے ہیں، اردو کے ادیب بے بدل ہیں، فارسی پر بڑی گہری نظر ہے، ایک زمانہ میں ان سے اور نیاز فتحپوری سے بڑی پرزور ادبی جنگ ہوئی، کسی کام سے لکھنؤ آئے، ندوہ میں ٹھہرے، اخراجات دار یا جامہ تن زیب کا انگرکھا، سر پر بہترین دوپلی ٹوپی، باتوں میں شوخی، انداز و اطوار میں طراری جتنے کم ہیں، ہنساتے زیادہ ہیں، ندوہ کے اوپر کے حصہ میں ٹھہرے تھے، میں چھوٹے درجہ کا ایک معمولی طالب علم تھا، دور سے نظارہ کیا، طبیعت بہت خوش ہوئی کہ ایسے آزاد مشرب ندوی بھی ہوتے ہیں، مولوی نیاز صاحب نے ان کی ایک پُر تکلف دعوت کی، پہلی مرتبہ معلوم ہوا، اختلاف و نبرد کے میدان میں دعوت کا دسترخوان بھی بچھ سکتا ہے۔

کئی برس گزر گئے، اب میں ندوہ کے ایک اونچے درجہ کا طالب علم تھا، میں نے اور عبدالسلام صاحب قدوائی (صاحب ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ) نے پروگرام بنایا، چند روز کے لیے دارالمصنفین اعظم گڑھ چلنا چاہیے، دیکھیں وہاں کی علمی اور مذہبی فضا کا کیا رنگ ہے؟ وہاں کے علماء بام مشائخ کے رہنے سہنے کا

کیا ڈھنگ ہے؟ رسول اکرمؐ کا یکتا سیرت نگار کس طرح رہتا ہے؟ خلفائے راشدین کے سوانح نویس، دن کیونکر بسر کرتے ہیں؟ کام کرنے کا کیا اسلوب ہے؟ تاریخ اسلام اور حقیقت اسلام کے مبلغ اور نقاد، رمز شناس، اور ماہر اٹھتے بیٹھتے کس طرح ہیں؟ رہتے سہتے کس طرح ہیں، بات چیت کرنے کا کیا ڈھنگ ہے؟ غرض ایک والہانہ جوش تھا، جو اعظم گڑھ لیے جا رہا تھا۔

ہم ناخواندہ مہمانوں کا چھوٹا سا قافلہ دارالمصنفین کی خانقاہ میں پہنچا، مولانا سید سلیمان نے وقار اور رعب کے ساتھ پذیرائی کی، مولانا مسعود علی ندوی نے رکھ رکھاؤ کے ساتھ استقبال کیا، وہی رکھ رکھاؤ جو بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان ہوتا ہے مولانا عبدالسلام ندوی نے پوچھا بھی نہ کہ کون آیا؟ اور کیوں آیا؟ ان کی فلسفیانہ بے خودی اس قسم کے معاملات پر غور فکر کی اجازت ہی نہیں دیتی، مولانا ریاست علی ندوی، اور مولانا معین الدین احمد ندوی بھی جی کھول کے ملے، لیکن بڑے پن کے ساتھ جیسے بڑا بھائی، چھوٹے بھائی کے ساتھ ملتا ہے، لیکن نجیب اشرف صاحب بغیر کسی سابقہ ملاقات اور تعارف کے اس محبت اس بے تکلفی، اور اس تپاک سے ملے جیسے برسوں کی ملاقات ہے، وقت کا زیادہ حصہ ہم نو واردوں کے ساتھ بسر کرتے، مزے مزے کی باتیں کرتے، اور باتوں باتوں میں ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ کرتے، ادبی، علمی، سیاسی ہر موضوع پر گفتگو کرتے، لیکن ایسی پر لطف، اور باحزہ کہ جی چاہتا باتیں کیے جائیں، اور شب ہجراں کی طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

اب کھانے کا وقت آیا، اور پہلا تجربہ بڑا خطرناک ہوا، ہم دونوں ٹھہرے ایک خوش خور، اور یہاں یہ حالت کہ سید صاحب نے دو لقموں کے بعد ہاتھ اٹھا لیا، مولانا مسعود علی نے بھی دو تین لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا، دوسرے لوگ کھاتے رہے، یہ رنگ دیکھ کر ہم نے سید صاحب کی تقلید میں، بادل نخواستہ

دستبرداری اختیار کرلی، کسی نے خیال بھی نہیں کیا، دو خالی پیٹوں پر کیا گزر رہی ہے لیکن دم سادھے ہوئے تھے، نجیب اشرف صاحب کی تیز نگاہیں ہمارا جائزہ لے رہی تھیں، لیکن خاموش تھیں خدا خدا کرکے شام ہوئی، اور پھر دسترخوان بچھا، خوشی کے بجائے کوفت ہوئی، آدمی فاقہ کرلے، تو زیادہ تکلیف نہیں ہوتی، پھر دو تین لقموں کے بعد، ہاتھ دھو لینا پڑیں گے، یہ قیامت ہے!

عبدالسلام صاحب نے پہلی ٹھوکر سے سبق لیا، اور دزدیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر، دیکھ کر، بڑے بڑے ہاتھ مارنا شروع کیے، اور میرا معاملہ وہی تھا، جو اس سارس کا، جس کی ایک پلیٹ میں دعوت کی گئی تھی، لیکن نجیب صاحب نے مختلف چیزیں میری طرف بڑھانا شروع کیں، یہ کھاؤ، یہ بھی کھاؤ، اسے چکھو، اتنی کم خوری سے کام لوگے، تو بے موت کے مرجاؤ گے، سید صاحب، اور مسعود علی صاحب اٹھ گئے، لیکن نجیب صاحب کھاتے اور کھلاتے رہے، عبدالسلام صاحب کی نوبت بدہضمی تک پہنچ گئی۔ لیکن میں نے بھی خوب شکم سیر ہوکر کھایا۔

دو تین روز کے بعد، واپسی ہوئی، دارالمصنفین کی تمام باتیں رفتہ رفتہ ذہن و دماغ سے اتر گئیں، لیکن نجیب صاحب کی عنایت کبھی نہ بھولی، پھر بہت برس بیت گئے، میں ندوہ سے جامعہ گیا، وہاں کئی سال رہا، پھر مولانا شوکت علی خلافت کا ایڈیٹر بناکر بمبئی لے آئے، یہاں آکر معلوم ہوا، نجیب صاحب یہیں یوسف اسمٰعیل گورنمنٹ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر ہیں، جی چاہا ملیں، لیکن کوئی سبیل نہ نکلی۔ یہ شہر سے ۱۵ - ۲۰ میل دور جوگیشوری میں رہتے تھے ایک بار قاضی کبیرالدین بیرسٹر نے، اسلام کلب (چوپاٹی) میں بمبئی کے ندویوں کی دعوت کی، وہاں نجیب صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، بڑا تغیر ہوگیا تھا۔ بال سارے سفید ہوگئے تھے یہ عمر کا تقاضہ نہیں تھا، نزلہ کا کرشمہ تھا، ایسی محبت اور اخلاق سے ملے کہ دارالمصنفین

کی یاد تازہ ہوگئی، اس اخلاق اور محبت نے دوری مسافت ختم کر دی اور آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا کبھی یہ خلافت ہاؤس آجاتے، کبھی میں جوگیشوری چلا جاتا، رفتہ رفتہ آنا جانا، بار بار ہونے لگا، اور تعلقات بہت زیادہ بڑھ گئے۔

ایک روز شام کو انھوں نے اپنے ہاں، میری اور مولانا عرفان کی دعوت کی، ایک خوشنما کوٹھی میں قیام تھا۔ سامنے ایک وسیع لان تھا، لیکن سب سے زیادہ ریت تھی، کھانا ابھی تیار نہیں ہوا تھا، اور یہ اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ان کی چھ سات برس کی ایک لڑکی آئی، اور گود میں بیٹھ گئی، اس کی ذکاوت کی تعریف کرنے لگے، کہنے لگے، میری بیوی کہتی ہیں، تمھاری ساری ذہانت اسی ایک لڑکی میں سما گئی ہے، وہ خوش خوش اپنی تعریف سنتی رہی، تھوڑی دیر کے بعد خاموشی سے اٹھی، اور دونوں مٹھیوں میں بہت سی ریت بھر لی، خراماں خراماں حاضرین کی طرف آئی اور بغیر کسی تمہید کے دونوں مٹھیوں کی ریت حاضرین کے چہروں پر نچھاور کر دی، یہ بڑے چکرائے بے ساختگی کے عالم میں ان کے منہ سے نکلا، "آگئیں تم اپنی اوقات پر؟" وہ جواب کیا دیتی یہ جا وہ جا، میں نے کہا، یہ بھی ذہانت کا رنگ ہے، کوئی مضائقہ نہیں، مولانا عرفان اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگے، کیونکہ ریت کا بڑا حصہ انہی کے چہرۂ انور پر پڑا تھا۔

سرکاری ملازمت نے، مطالعہ کا حوق بڑھا دیا ہے، لیکن لکھنے کی قوت چھین لی ہے، کالج سے واپس آتے ہیں، تو حقہ پیتے ہیں اور کتابیں پڑھتے ہیں، جس شخص نے مقدمہ عالمگیر جیسی زبردست اور مایۂ ناز تاریخی کتاب لکھی ہے، وہ اب اتنا خاموش ہے کہ

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

خدا کرے انھیں جلد پنشن ملے، تاکہ، پھر ایک سے بڑھ کر ایک کتابیں لکھیں، ان کی خاموشی نے علمی صفوں میں جو جگہ خالی کر دی ہے، وہ پھر انہی سے پُر ہو جائے!

یہ مضمون جو ابھی تک غیر مطبوعہ تھا میں نے پاکستان آنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا۔

اب نجیب صاحب پنشن پا چکے ہیں، مستقل اقامت بمبئی کی اختیار کر لی ہے، انجمن اسلام بمبئی کے شعبۂ تحقیق میں اردو سکشن کے انچارج ہیں۔

نومبر ۱۹۶۰ء میں تقسیم ہند کے بعد پہلی مرتبہ بمبئی گیا، ——— دہلی، لکھنؤ، اور یادش بخیر خیر آباد بھی — بمبئی کے دوست جس محبت، تپاک، اور گرم جوشی سے ملے اسے کبھی نہ بھول سکوں گا، میں محبت تپاک، اور گرم جوشی کی سوغات لے کر انجمن اسلام ان سے ملنے پہنچا، یہ دوسری منزل پر تھے، میں قلب کا مریض ہوں، سیڑھی چڑھنے کی ممانعت ہے، میری خاطر یہ عرش سے اتر کر فرش پر، یعنی دوسری منزل سے گراؤنڈ فلور پر تشریف لائے، لیکن اتنے ہراساں جیسے چاروں طرف سی آئی ڈی لگی ہوئی ہے، اور یہ ڈر رہے ہیں کہیں "رپورٹ" نہ ہو جائے، ابتلا کی یہ کیفیت دیکھ کر میرا دل کڑھا۔ میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا، لیکن پھر ملنے نہیں گیا!

بھول جا، خوش رہ، عبث وہ سابقے مت یاد کر
ورنہ یہ مذکور ہے آشنا تھا یا نہ تھا، ؟

(ستمبر ۱۹۶۱ء)

کتابیں ہی کتابیں

قواعدِ اُردو اردو کے مزاج اور قوعد زبان پر بابائے اردو مولوی عبدالحق بالقابہ کی نگارشات قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ قواعد اُردو ہماری زبان کی پہلی مستند اور سائینیٹک گرامر ہے۔ اس کا یہ خاص ایڈیشن بعد نظر ثانی ان کی ذاتی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔ مجلد قیمت ۵/-

انتخاب کلام میر — ندائے سخن میر کے متقدین کا حلقہ اب تک بہت وسیع ہے۔ لیکن بیس پچیس برس ادھر ان کی خوبیوں پر فقط خواص کی نظر تھی۔ — ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہٗ نے اپنے اس انتخاب اور دیباچے کے ذریعے ادب کے تمام طالب علموں کو دنیائے میرؔ کی رنگارنگی سے روشناس کیا اور میر کے مطالعے کی بنیاد ڈالی۔
اس کتاب کے گذشتہ ایڈیشن کتابت کی غلطیوں سے بھرپور تھے۔ اب نظر ثانی اور تصحیح کے بعد یہ خالص ایڈیشن مجلد شائع کیا ہے۔ قیمت ۔ ۴/۵۰

چند مجموعہ نظم

پرچھائیاں ساحرؔ لدھیانوی ۔ ہمارا ساحرؔ ۔ ہماری نسل کا سجیلا شاعر ساحرؔ اپنا جادو شیریں زبانی سے بھی جگاتا ہے، آتش بیانی سے بھی پرچھائیاں ساحرؔ کی پہلی طویل نظم ہے۔ آرٹسٹ کی تصاویر۔ خوبصورت گرد پوش عمدہ جلد ۱/۲۵

گاتا جائے بنجارا گاتا جائے بنجارا ساحرؔ لدھیانوی کے نغمات کا مجموعہ ہے ساحر نے گیت کو ایک نئی زندگی بخشی ہے اور انہی خدمات کے تحت اُسے جون ۱۹۵۵ء کو سال کے بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ قیمت ۳/۰

تلخیاں ساحرؔ لدھیانوی ۔ ساحرؔ لدھیانوی کا پہلا مجموعہ کلام تلخیاں نئی نظموں اور غزلوں کے اضافے کے ساتھ چھپ کر تیار ہے۔ خوبصورت طباعت۔ سہ رنگا گرد پوش۔ ولائتی کپڑے کی جلد ۳/۰

چاند نگر۔ ابنِ انشاؔ — چاند نگر ۱۹۵۵ء میں چھپی تو ادبی دنیا چونک

اٹھی۔ ایک نیا خوشگوار، تازہ لب ولہجہ سنائی دیا، شعری زبان کو ایک نئی سمت ایک نئی شخصیت ملی۔ ابن انشاء مستقبل کا شاعر ہے۔ اس کی آواز میں وہ کس بل موجود ہے۔ جو عہد آفرین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ دوسرا خوبصورت ایڈیشن ۴/۰

دوسرا مجموعہ — چھوٹی باتیں — زیر طبع

چینی نظمیں (منظوم ترجمے) ابن انشاء۔ لاہور میں ایک چینی موچی کی دکان پر ایک جوتا تھا۔ عمدہ، نفیس، ابن انشاء نے اسے دیکھا اور پسندیدگی سے کہا میں اس کا ترجمہ کروں گا۔ شاید یہ سزا لطیفہ ہو لیکن چین اور چینیات سے ابن انشاء کے گہرے شغف کی گواہی دیتا ہے۔ جو لوگ چینی شاعری کی سادگی اور نازکی اور ابن انشاء کے طرز ادا کی مٹھاس اور چاؤ کے قدردان ہیں۔ خود جان سکتے ہیں۔ یہ کتاب ایک دلکش جھروکا ہے۔ چہار رنگا گرد پوش قیمت ۳/۰

شہر آذر مصطفےٰ زیدی۔ مصطفےٰ زیدی کا کلام ہماری شاعری کی جدید اور قدیم دنوں دھوم سے اس قدر مختلف ہے کہ اس رسمی اصلاحات میں تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ زیدی کا شعر ہماری جدید شاعری میں ایک انوکھا، پُراسرار اور دلکش اضافہ ہے۔ فیض احمد فیض قیمت ۳/۵۰

موج مری صدف صدف مصطفےٰ زیدی۔ مصطفےٰ زیدی اردو کے جہانیاں جہاں گرد شاعر ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب وہ انگلستان میں تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹی کار پر تمام یورپ اور مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ "موج مری صدف صدف" اسی مسافت کی جذباتی روئداد ہے۔ چہار رنگا گرد پوش ۳/۵۰

اسلامی تاریخی ناول

فتح قسطنطنیہ:۔ رئیس احمد جعفری۔ فتح قسطنطنیہ رئیس احمد جعفری کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ جس میں قسطنطنیہ کے فتح کی داستان نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ سہ رنگا ہاف ٹون گرد پوش ۵/۰

اسلام کے غازی یورپ میں رئیس احمد جعفری — اس کتاب میں فاضل مصنف نے یورپ پر عربوں کی فاتحانہ یلغار کے سلسلے میں بڑا مستند اور بے انتہا مواد پیش کیا ہے۔ بڑا ساز قیمت ۶/۰

ٹام راج سے رام راج تک۔ رئیس احمد جعفری۔ تاریخ کا یہ باب جو جعفری صاحب نے

آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب بھی نایاب ہے۔ اور چند سال بعد تو شاید ناپید ہو جائے گا۔ حالانکہ یہی مواد ہے جو آگے چل کر ماخذ بنے گا۔ اور اسے سامنے رکھ کر تاریخیں لکھی جائیں گی۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کا مواد جہاں اور جتنا کچھ بھی ملے محفوظ کر لیا جائے۔ فاضل مصنف کی یہ کوششیں اس جذبہ کا نتیجہ ہے۔

قیمت ۵/۰ بڑا سائز

منگول رئیس احمد جعفری۔ دنیا کا ظالم ترین فاتح چنگیز خاں منگول بگولے طرح اٹھا۔ اور آندھی کی طرح چھا گیا۔ رئیس احمد جعفری کے طرز بیان نے اس میں اور بھی جان ڈال دی ہے۔ ۵/۰

صلیبی جنگیں رئیس احمد جعفری۔ غازی صلاح الدین ایوبی اور چرڈ کے درمیان جو جنگیں لڑی گئیں۔ انہیں جناب رئیس احمد جعفری نے دل کش انداز میں قلم بند کیا ہے۔ سہ رنگا گرد پوش۔ ۵/۰

مغل اعظم اختر یونس۔ شہنشاہ اکبر جسے تاریخ میں مغل اعظم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جہاں اپنے وقت کا مدبر حکمران تھا وہاں نہایت جابر و قاہر بادشاہ تھا اور اس کے ظلم کا نشانہ اس کا بیٹا سلیم بھی بن گیا۔

انارکلی کی دلخراش داستان، ایک کنیز کی محبت کی کہانی جسے صرف اسلئے دیوار میں چنوا دیا گیا۔ کہ وہ کنیز تھی ایک عام لڑکی تھی۔

جو میں ایسا جانتی پیت کے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت کرے نہ کوئے

قیمت ۵/۰

ہلاکو خاں اختر یونس۔ تاتاری سردار ہلاکو خاں اپنے دادا چنگیز خاں کی طرح ظالم فاتح تھا۔ اس نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس تاریخ کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے ایک دلکش رومان کو اس طرح سمویا ہے کہ آپ اس ناول کو پڑھ کر عش عش کر اٹھیں گے۔ سہ رنگا چھاپ ٹین گرد پوش ۶/

داراشکوہ اختر یونس۔ اورنگ زیب کا بھائی داراشکوہ بڑا ہی خود پسند اور خود رائے تھا اور اسے اپنی عقل مندی اور معاملہ فہمی پر اسقدر بھروسہ تھا کہ کبھی کسی کو صلاح مشورہ دینے کی جرات ہی نہیں ہوتی تھی لیکن اس کی دانش مندی

اور معاملہ فہمی ہی اس کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی اور وہ اپنے بھائیوں کی سازشوں سے آگاہ نہ ہوسکا اور گرفتار ہوکر اورنگ زیب کے دربار میں لے جایا جا رہا تھا تو سارے دہلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔

اس تاریخ کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے ایک رومان بھی اس طرح سمویا ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہیں چھوڑ سکتے۔ ۸/۷۵

خطبات مدراس ۔ سید سلیمان ندوی۔ سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر وہ آٹھ خطبے جن کو سید سلیمان ندوی نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ میں مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے لالی امداس، میں ہفتہ وار دیا، قیمت۔ ۳/-

رحمتِ عالم ۔ سید سلیمان ندوی۔ اسلام کا گلدستہ جس دھاگے سے بندھا ہے وہ رحمتِ عالم کا وجود پاک ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس وجود پاک کے سوانح کا ایک ایک حرف ہر مسلمان کے کان تک پہنچایا جائے تاکہ یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ مولانا نے اس پاکیزہ مقصد کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ قیمت ۲/۵۰

توبتہ النصوح ۔ مولوی نذیر احمد دہلوی۔ مولوی صاحب کی سب سے مشہور اور ممتاز تصنیف ہے۔ اس کے ذریعے مصنف نے بڑے واضح طور پر اپنا نظریہ حیات بیان کیا ہے۔ قیمت ۲/۵۰

رستم وسہراب ۔ آغا حشر کاشمیری۔ آغا حشر کاشمیری ہمارے تمثیل کا سب سے نمایاں نام ہے۔ اور رستم وسہراب آغا حشر کی پرشکوہ الفاظ پر ... کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اردو کا کوئی ادب بھی رستم وسہراب کی برابر نہیں کرسکتا۔ قیمت ۱/۵۰

لاہور اکیڈمی لاہور

۲۰۵ سرکلر روڈ — لاہور

A F & CO.